ماہنامہ

ترجمان القرآن

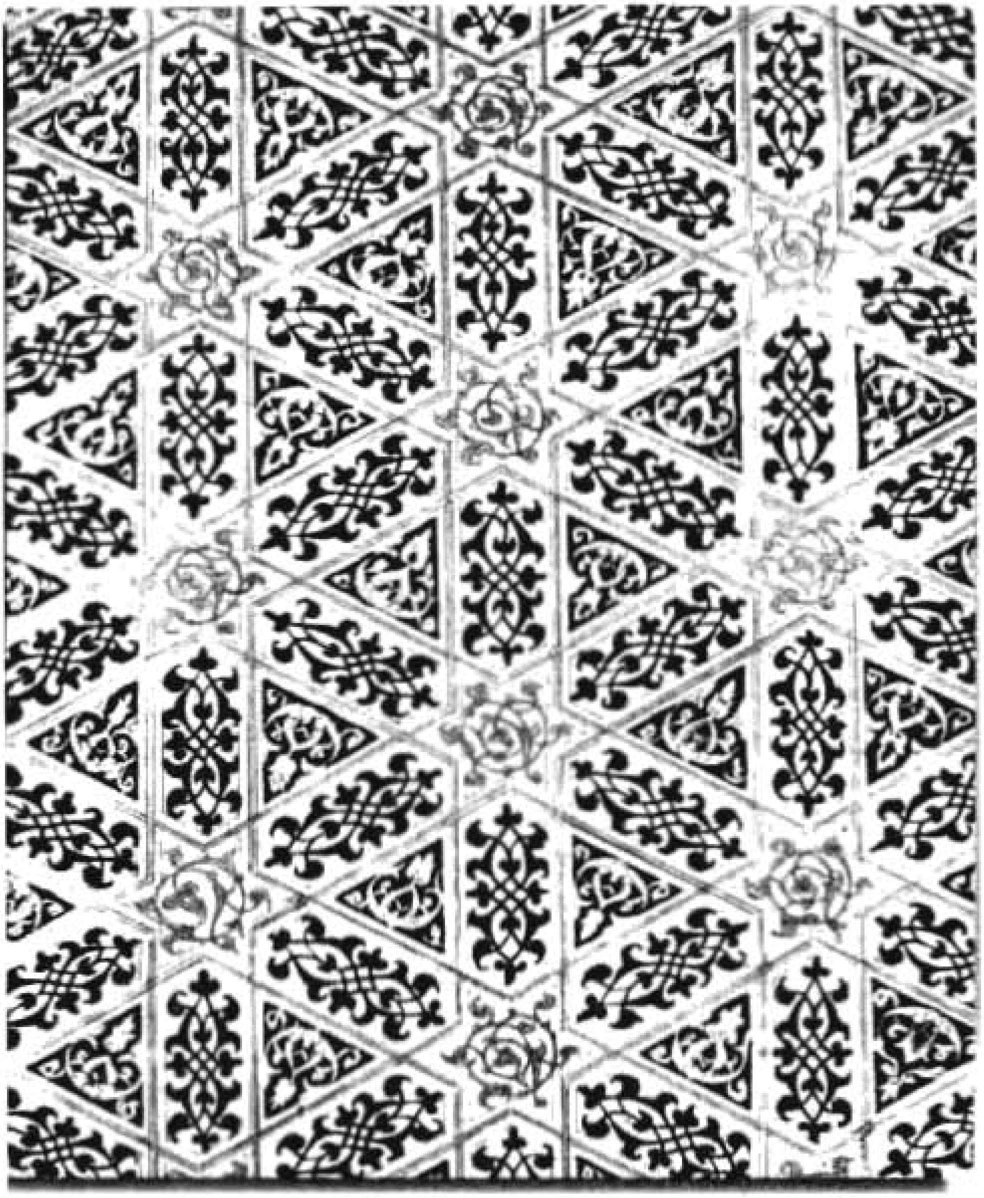
جاری کردہ

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

۱۹۹۸ء

مُدیر

خورشید احمد



ادارہ ترجمان القرآن

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مدیر: خورشید احمد | نائب مدیر: مسلم سجاد

جلد ۲۵ | مارچ ۱۹۹۸ء ذیقعد ۱۴۱۸ | عدد ۳

ترتیب

ادارتی امور

منصورہ، ملتان روڈ، لاہور ۵۴۵۷۰

فون: ۷۸۳۳۶۰۵

فیکس: ۷۸۳۲۱۹۴

انتظامی امور

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

فون: ۷۵۸۷۹۶۱ - ۷۵۸۵۵۹۰

☆

قیمت فی شمارہ ۱۵ روپے

زرسالانہ ۱۵۰ روپے

بھارت ۳۰۰ روپے

بنگلہ دیش، ایران ۳۵۰ روپے

مشرق وسطیٰ، یورپ

مشرق بعید، افریقہ ۶۵۰ روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ۹۰۰ روپے

بنک ڈرافٹ

بنام ماہنامہ ترجمان القرآن ارسال فرمائیں

۶۰ سال پہلے

ذیل کا مضمون سنگاپور کے رسالہ Genuine Islam سے ترجمہ کر کے یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ مسلمانوں میں یہ اشتراکی فتنہ جس تیزی سے پھیلتا جا رہا ہے' اس کو روکنے کے لیے ضروری ہے کہ اس قسم کے مضامین کثرت کے ساتھ شائع کیے جائیں تاکہ عامہ مسلمین اور خصوصاً ان کے علما اس مسلک کی حقیقت سے واقف ہو جائیں۔

فاضل مضمون نگار ابھی تک اس غلط فہمی میں ہیں کہ اشتراکیت کا طاعون صرف نئے تعلیم یافتہ نوجوانوں ہی میں سرایت کر رہا ہے۔ مگر ان کو معلوم نہیں کہ اب یہ جراثیم ہمارے "آزادی پسند" علما کی جماعت میں بھی پہنچ گئے ہیں۔ یہ بے چارے علما اشتراکیت کے اصل ماخذ تک تو پہنچ نہیں سکتے۔ ان کی معلومات کا تمام سرمایہ صرف ان لوگوں کے بیانات ہیں جو کانگریس کی خدمت میں ان کے شریک کار ہوتے ہیں اور انھیں دور اشتراکیت کے سراب دکھاتے ہیں۔ چنانچہ اپنے ان شرکاء کار کے جادو سے مسحور ہو کر اب مولویوں نے بھی اشتراکیت کے سر میں سر ملانا شروع کر دیا ہے۔ ابھی ہم نے سنا کہ جمعیت العلما کے ایک ذمہ دار رکن جو اس سے پہلے جمعیت کے نائب ناظم بھی رہ چکے ہیں' چشم بد دور' قرآن سے اشتراکیت ثابت فرماتے ہیں۔ ایک اور صاحب جن کا شمار ہندستان کے مشہور مذہبی لیڈروں میں ہوتا ہے' صوبہ متحدہ میں اشتراکیت کی تبلیغ کرتے پھرتے ہیں۔ ایسے بے علم علما اگر خدا کے سامنے اپنی جواب دہی کا حقیقی اعتقاد رکھتے ہیں تو ان کا فرض ہے کہ پہلے علم حاصل کریں' پھر زبان کھولنے کی جرات کریں۔ (مدیر)

..... ابھی اس جدید تحفے کو آئے چند ہی سال ہوئے ہیں کہ ہاتھوں ہاتھ ہماری نئی تعلیم یافتہ نسل نے اس کو لینا شروع کر دیا۔ ان میں سے ایک گروہ تو ایسا ہے جو جان بوجھ کر اشتراکیت کو ایک الگ "مذہب" سمجھتے ہوئے قبول کر رہا ہے' مگر بہت سے ایسے بھی ہیں جنھوں نے محض ظاہر میں یہ دیکھ کر کہ اسلام اور اشتراکیت دونوں سرمایہ داری اور امپیریلزم کے خلاف ہیں' دونوں غریب طبقوں کی رفاہیت چاہتے ہیں' اور دونوں انسانی مساوات کے داعی ہیں' یہ نتیجہ نکال لیا ہے کہ دونوں ایک ہی چیز ہیں اور مسلمان بہ یک وقت مسلمان بھی ہو سکتا ہے اور اشتراکی بھی۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع بھی کر سکتا ہے اور مارکس کا بھی۔

مگر کیا یہ حقیقت ہے؟ اشتراکیت کے عقائد کا ایک سادہ بیان ہی یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ ان دونوں میں بعد المشرقین کی نسبت پائی جاتی ہے۔ اشتراکیت عین ضد ہے اسلام کی۔ (محمد فضل الرحمٰن انصاری بی-اے (علیگ)' اشتراکیت اور مذہب و اخلاق

ترجمان القرآن' جلد ۱۲' عدد ۱' محرم ۱۳۵۷ھ' مارچ ۱۹۳۸ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

مشرقِ وسطٰی اور سامراجی سیاست

پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق؟

خورشید احمد

ایک نئی اور خوفناک خلیجی جنگ کے شعلے بڑی تیزی سے عراق کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ جس وقت آپ یہ سطور پڑھ رہے ہوں' امریکہ اور برطانیہ کے لڑاکا طیارے اور میزائل سرزمین عراق پر آگ اور خون کی بارش شروع کر چکے ہوں۔ گو' اس کا بھی امکان ہے اور ہماری نگاہ میں غالب امکان یہی ہے کہ وسیع پیمانے پر لام بندی کے بعد ایک بار پھر وقتی طور پر خاک و خون کی یہ ہولی موخر کر دی جائے اور اور بلی اور چوہے کا کھیل اس طرح جاری رہے جس طرح خصوصیت سے پچھلے پچاس برسوں سے کھیلا جا رہا ہے۔ فضا کی آلودگی میں کوئی کمی نہ ہو' امن و آشتی کا حصول محال رہے' عوام اپنے حقوق سے محروم رہیں' معاشی وسائل امریکی اور یورپی اقوام کے مفاد میں استعمال ہوتے رہیں' حکمران بدستور عیش و عشرت کرتے رہیں' مسئلہ فلسطین اور بھی الجھ جائے' اسرائیل کی بالادستی محکم تر ہوتی جائے اور امریکہ معاشی' سیاسی اور عسکری اعتبار سے علاقے کا اصل حکمران رہے۔ جنگ' جنگ کی دھمکی' جنگ کے لیے فضا بنانا اور جنگ سے گریز یہ سب دراصل ذریعہ ہیں نئے نئے عنوانوں سے اپنی گرفت کو علاقے پر مضبوط کرنے اور امت مسلمہ کو اس مرکزی اور تاریخی اہمیت کے علاقے میں حقیقی آزادی اور اس کے دین و ایمان' ثقافت و تہذیب اور عوامی امنگوں کے مطابق ترقی کے مواقع اور ثمرات سے محروم رکھنے کا۔

مشرق وسطٰی ایک آئینہ ہے جس میں پوری امت کے المیے کی تصویر دیکھی جا سکتی ہے۔ امریکہ' مغربی اقوام اور اقوام متحدہ' اسرائیل' عرب دنیا کے حکمران' ترکی کی موجودہ قیادت' عراق کا حکمران ٹولہ اور صدام حسین یہ سب اس ڈرامے کے مختلف کردار ہیں۔ میدان جنگ کے نقشوں کا بننا اور بگڑنا اسی کا ایک حصہ

ہیں۔ تادیبی کارروائیاں (sanctions) اور ان میں سہولتیں' دعوے اور دلائل' حقیقی عزائم اور سازشیں' دھمکیاں اور کہہ مکرنیاں' وعدے اور وعدہ خلافیاں ان سب ہی سے اس ڈرامے کے ڈائیلاگ عبارت ہیں--- البتہ اس پورے معاملے میں' بدقسمتی سے' جن کا کوئی رول نہیں وہ--- مسلمان عوام ہیں--- حالانکہ وہی زمین کے اصل وارث اور حق دار ہیں۔ ۱۹۹۱ کی خلیجی جنگ کے بعد ڈرامے کا پلاٹ اور بھی کھل کر سامنے آگیا ہے۔ اگر کوئی ابہام تھا تو وہ دور ہو گیا ہے اور جو کچھ اس وقت ہو رہا ہے وہ اس نقشے کے عین مطابق ہے۔ اس لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ حالات کا محض سطحی نظر سے جائزہ نہ لیا جائے بلکہ جو حقیقی کھیل کھیلا جا رہا ہے اسے سمجھا جائے اور دشمن کی اصل چالوں کا مقابلہ کرنے کے لیے امت کو بیدار اور تیار کیا جائے۔ عراق کی تازہ صورت حال وہ لمحہ فکریہ فراہم کرتی ہے جسے امت مسلمہ کو ہرگز ضائع نہیں ہونے دینا چاہیے۔

بیسویں صدی میں مشرق وسطیٰ کی قسمت کا فیصلہ جن سامراجی قوتوں کے ہاتھوں میں رہا ان میں اولیں برطانیہ اور فرانس تھے' پھر اٹلی نے اپنا حصہ بنایا اور آخر کار امریکہ اور روس نے پنجے گاڑ دیے۔ مگر عالمی طاقت کے طور پر روس کی پسپائی کے بعد' اب امریکہ نقشوں میں رنگ بھرنے اور تصاویر بنانے اور بگاڑنے میں کلیدی کردار ادا کر رہا ہے۔

پہلی جنگ کے اختتام (۱۹۱۸) سے پہلے ہی مشرق وسطیٰ کے نئے سیاسی جغرافیے کا نقشہ (geo-political map) بنا لیا گیا تھا۔ اس کی بنیاد مئی ۱۹۱۶ کے اینگلو فرنچ معاہدے میں طے ہوئی جو سائیکس پی کاٹ معاہدہ (Sykes Picot Agreement) کے نام سے معروف ہے اور جس کے تحت ان دونوں سامراجی طاقتوں نے پورے علاقے کی اپنے درمیان بندر بانٹ کر لی تھی۔ پھر ۱۹۱۷ کے اعلان بالفور کے ذریعے اس میں اسرائیل کے لیے جگہ بنائی گئی۔ ۱۹۲۰ کے معاہدہ سیورز (Treaty of Severs) کے تحت اگرچہ دولت عثمانیہ کا قصہ ختم کر دیا گیا تھا تاہم ترک مجاہدین کی عظیم جدوجہد نے اناطولیہ پر ترک اقتدار کو بچا لیا۔ پھر خلافت عثمانیہ کی تجہیز و تدفین اور سیکولر نظام کے قیام کی قیمت پر ۱۹۲۳ کے معاہدہ لوسان (Treaty of Lausanne) کے تحت ایک محدود علاقے پر ترک ری پبلک کو تسلیم کیا گیا' مگر اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر!

ٹی ای لارنس جو برطانیہ کا جاسوس اور کارندہ تھا اپنی کتاب "حکمت کے سات ستون" (Seven Pillars of Wisdom) میں اس کھیل کے کچھ پہلو بیان کرتا ہے جو دولت عثمانیہ کو تباہ کرنے' عرب قومیت کو ابھارنے اور برطانوی استعمار کے قدم جمانے کے لیے کھیلا گیا۔ عربوں کو ترکوں کے مقابلے میں اٹھایا گیا اور دونوں میں اسلامی قومیت کی جگہ لسانی اور علاقائی قومیت کو فروغ دیا گیا۔ عربوں میں اپنی کامیابی کے بارے

میں لارنس دعویٰ کرتا ہے کہ "میرا مقصد ایک نئی قوم کی تشکیل تھا' اس کے کھوئے ہوئے رسوخ کی بحالی (I meant to make a new nation; to restore a lost influence) (کتاب مذکور' مطبوعہ لندن' ۱۹۴۰' ص ۲۳) نیز یہ سنہرا خواب بھی دکھاتا ہے کہ:

We could see a new factor was needed in the East, some power or race which would outweigh the Turks in numbers, in output and in mental activity. (ص - ۵۶)

ہم نے صاف دیکھ لیا تھا کہ مشرق میں ایک نئے عامل کا وجود ناگزیر ہے۔ ایک ایسی سیاسی طاقت یا نسلی قوت جو ترکوں پر اپنی عددی پوزیشن' پیداوار کی صلاحیت اور فکری حرکت کی بنا پر سبقت لے جاسکے۔

یہ نئی قوت بظاہر موعودہ عرب ریاست تھی جو کبھی وجود میں نہ آئی اور اس کی جگہ ایک درجن (اور اب ۲۲) عرب مقبوضہ علاقے وجود میں آئے اور ان سب پر مغربی اقوام کا تسلط قائم کیا گیا اور آخرکار اسرائیل کو علاقے کی سب سے مضبوط اور بالاتر ریاست بنا کر اسے امریکہ اور یورپی اقوام کی عسکری چھتری کا تحفظ عطا کیا گیا۔ ۱۹۱۹ کے معاہدہ ورسیلز (Treaty of Versailles)' لیگ آف نیشنز کے ۱۹۲۲ کے پروٹوکول آف مینڈیٹ سے لے کر ۱۹۴۸ کی اقوام متحدہ کی تقسیم فلسطین اور قیام اسرائیل کی قرارداد' اور اس کے بعد ۱۹۶۷' ۱۹۷۳ اور ۱۹۹۱ سے لے کر آج تک کی سلامتی کونسل کی قراردادیں' اور کیمپ ڈیوڈ سے لے کر اوسلو معاہدے تک' سب' دراصل شرق اوسط کو منقسم رکھنے' کمزور رکھنے اور اپنی گرفت میں رکھنے کے در و بست ہیں۔ اس پورے المیے کی تصنیف و تالیف میں جہاں سامراجی قوتوں کا کردار کلیدی تھا' وہیں علاقے کے اپنے لیڈروں کا کردار بھی کچھ کم فیصلہ کن نہ تھا۔ ذاتی اغراض' خاندانی اقتدار اور دولت کے حصول کے لیے ہر علاقے میں کچھ عناصر نے مغرب کی استعماری قوتوں کے دست و بازو کا کردار ادا کیا اور یہی صورت حال ناموں کی تبدیلی اور عنوانات کے تغیر کے ساتھ اس وقت تک جاری ہے۔

دل کے پھپھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

ایک عرب دانشور حلیم برکات اپنی کتاب' The Arab World: Society, Culture and State (مطبوعہ یونی ورسٹی آف کیلی فورنیا پریس' برکلے' لندن ۱۹۹۳) میں ۱۹۹۱ کی خلیجی جنگ کے بعد کی صورت حال کی یوں منظر کشی کرتا ہے:

خلیج کی جنگ نے عربوں کے اس اعتماد کو متزلزل کر دیا کہ وہ خواب اور حقیقت کے درمیان خلا کو پر کر کے ایک نیا آغاز کر سکتے ہیں۔ اچانک انھوں نے اپنے کو ایک ایسی صورت حال میں پایا جو اس سے مختلف نہ تھی جس کا تجربہ انھیں پہلی جنگ عظیم کے بعد ہوا تھا۔ آزادی اور اتحاد کے ایک نئے دور

کے بجائے وہ مغرب کے غلبے اور مزید ٹکڑے ٹکڑے ہونے کی دھمکیوں کا سامنا کر رہے ہیں۔ ان کے پرامید خوابوں کی جگہ پریشان کن مذاکرات نے لے لی ہے۔ عرب اپنی شکست اور ناکامیوں کا الزام مغرب پر رکھتے ہیں مگر اپنے آپ کو بھی قصوروار ٹھہراتے ہیں۔ میں اس دعوے کو دہرانا چاہتا ہوں کہ احساس اجنبیت کی تباہ کن حالت عربوں کی موجودہ مصیبت کی ذمے دار ہے۔ میری بنیادی دلیل یہ ہے کہ عرب شہری بے اختیار کر دیے گئے ہیں کیونکہ انھیں سیاسی عمل سے خارج کر دیا گیا ہے' کنارے لگا دیا گیا ہے اور ان سیاسی اور مادی وسائل سے علیحدہ کر دیا گیا ہے جو ایک سول سوسائٹی ان کے حوالے کرتی ہے۔ علاقے کے عوام معاشرے پر ریاستی جبر کی مصائب برداشت کر رہے ہیں۔ عرب ریاستیں اور حکمران اپنے معاشرے کے خلاف ایک طاقت بن گئے ہیں' اس لیے کوئی تعجب کی بات نہیں کہ عرب عوام اجنبیت کے شدید احساس کا شکار ہیں۔ عربوں کو فیصلوں پر اثرانداز ہونے کے حق سے محروم کر دیا گیا ہے۔ ان کا اس میں کوئی دخل نہیں کہ تیل سے حاصل ہونے والی بیش بہا دولت اور ان کی محنت سے پیدا ہونے والے لامحدود وسائل کس طرح کام میں لائے جائیں۔ سیاسی اقتدار کی طرح معاشی طاقت بھی چند خاندانوں اور قبائلی سرداروں کا استحقاق ہو گئی ہے۔ بیرونی محاذ پر عرب' مغربی صیہونی بالادستی کا شکار ہیں۔ اندرونی محاذ پر وہ آزادی اور شرف انسانی سے محروم ہیں (ص ۲۶۹-۲۷۷)۔

یہ حالات کا ایک حقیقت پسندانہ اظہار ہے جو کمزوری کے اصل اسباب اور عوامل کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ خود مغرب کے سوچنے سمجھنے والے عناصر کا تجزیہ بھی اس سے مختلف نہیں۔ صدر کارٹر کا قومی سلامتی کا مشیر' برزنسکی اپنی تازہ کتاب' Out of Control میں عرب دنیا کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتا ہے:

> کش مکش اور عدم استحکام' مشرق وسطی اور جنوبی یوریشیا پر محیط اسلامی علاقوں کی مرکزی اور مستقل حقیقتیں رہنے کا امکان ہے۔ عربوں کا روایتی عدم اتحاد' جسے مغربی طاقتیں جو عربوں کے تیل کی فراہمی پر اپنا کنٹرول رکھنے میں دلچسپی رکھتی ہیں' جان بوجھ کر بڑھاتی ہیں' مستقل علاقائی عدم استحکام میں اضافہ کرے گا۔ (Out of Control: Global Turmoil on the Eve of the Twenty-First Century, by Zbigniew Brzezinski, Simon and Schuster, New York, 1995. (ص ۲۱۴)

مشرق وسطی میں تھوڑے تھوڑے عرصے کے بعد جو خونی ہولی کھیلی جا رہی ہے اور جس طرح ایک بحران کے بعد دوسرا بحران اسے اپنی لپیٹ میں لے رہا ہے اور ایک ملک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو رہا ہے اسے سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس اندرونی تناظر اور بیرونی قوتوں کے سامراجی کھیل کو سمجھا جائے۔ خلیج کی جنگ محض کویت پر عراق کے حملے کا نام نہیں (گو یہ اقدام ہر اعتبار سے قابل مذمت تھا اور ہے) بلکہ اسے اس پس منظر اور پیش منظر میں دیکھنا ضروری ہے جو آج مشرق وسطی کا المیہ بن گیا ہے۔

آج امریکہ اور برطانیہ عراق پر حملے کے لیے بہانے تلاش کر رہے ہیں اور اقوام متحدہ کی قراردادوں کو من مانے معانی پہنانے کی کوشش کر رہے ہیں حالانکہ اگر بصیرت کی نگاہ سے ان تمام حالات کا جائزہ لیا جائے تو یہ سب ایک گھناؤنے ڈرامے کے پلاٹ نظر آتے ہیں۔ ایران میں اسلامی انقلاب، افغانستان میں تحریک جہاد اور فلسطین میں انتفاضہ وہ سنگ ہائے میل ہیں جو امت مسلمہ کے بالعموم اور عرب دنیا کے بالخصوص اسلامی احیا کی منزل کی طرف پیش رفت کی علامت ہیں۔ لیکن یہی وہ پہلو ہیں جو مغرب کے لیے خطرے کی گھنٹی بن گئے اور سامراجی قوتیں اسلامی احیا کا راستہ روکنے کے لیے علمی اور عملی، ہر سطح پر ایک موثر حکمت عملی سے آراستہ ہو کر میدان میں آگئیں۔ جس صدر صدام حسین کو آج ہٹلر کے روپ میں پیش کیا جا رہا ہے، اسے ہٹلر بنانے کا کام انھی مغربی اقوام نے انجام دیا۔ اسے خطرناک ترین اسلحہ سے مسلح کیا، تمام عرب ممالک نے تیل کی دولت کا بہاؤ اس کی طرف کر دیا اور ایران عراق جنگ کے شعلوں نے مشرق وسطیٰ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس جنگ میں ایران اور عرب ممالک کے سات آٹھ سو ارب ڈالر پھونک دیے گئے اور لاکھوں انسانوں کو لقمہ اجل بنا دیا گیا۔ جب یہ جنگ ختم ہوئی تو امریکہ اور مغربی اقوام نے محسوس کیا کہ عراق کو ایسی عسکری قوت اور بنیادی ڈھانچہ (infrastructure) حاصل ہو گیا ہے جس کے نتیجے میں علاقے کی قوت کا توازن اسرائیل کے خلاف ہو سکتا ہے۔ چونکہ اسرائیل کا تحفظ اور علاقے میں اس کی بالادستی امریکی اور یورپی اقوام کے پالیسی اہداف میں مرکزی اہمیت رکھتی ہے، اس لیے ایک نئی جنگ کی ضرورت تھی جس کے ذریعے عراق کی اس قوت کو تباہ کیا جا سکے اور عرب ممالک کے پاس جو معاشی دولت ہے اس سے انھیں محروم کیا جا سکے۔ ایک طرف صدام کو کویت پر حملہ کے لیے ہری جھنڈی دکھائی گئی (جس کا ثبوت خود امریکی سفیرہ کا بیان اور برطانوی سابق وزیر ٹونی بن کی شہادت ہے کہ خود صدام نے اسے بتایا کہ اسے اس کی ترغیب دی گئی) اور دوسری طرف کسی مشورے کے بغیر اور عوام کی شدید نفرت کے باوجود عرب ممالک کی حفاظت کے نام پر امریکہ اور یورپی اقوام کی فوجیں میدان میں اتار دی گئیں۔ جب جنگ ہوئی تو صدام اور اس کی فوج نے جو ایک طرف "ملور جنگ" کی باتیں کر رہا تھا اور بروقت کسی سمجھوتے کے لیے تیار نہ تھا، عملاً جنگ میں کوئی کارنامہ انجام نہ دیا جس کے نتیجے میں لاکھوں انسان لقمہ اجل بنے، فوجی قوت کا بڑا حصہ تباہ ہو گیا، اسرائیل کو کوئی نقصان نہ پہنچا اور جنگ کا سارا خرچ اور اس کے بعد کی تباہی کی شکل میں سارا خمیازہ عرب ممالک کو بھگتنا پڑا۔ اس کا اندازہ خود عرب مالیاتی فنڈ کی ایک رپورٹ کے مطابق ۷۰۰ بلین ڈالر ہے جو پوری اسلامی دنیا کے بیرونی قرض کی رقم سے دوگنا ہے۔ اس سب کے باوجود صدام حسین اسی طرح برسراقتدار رہا اور ہے اور رکھا جائے گا تاکہ امریکی فوجیں عرب سرزمین پر خلیج کے سمندروں پر موجود رہیں، اپنی گرانقدر خدمات کا سود در سود معاوضہ وصول کرتی رہیں، عرب ممالک کے لیے صدام حسین کا "خطرہ" بھی موجود رہے

اور وقتاً فوقتاً ایسی جھڑپیں ہوتی رہیں جن کے نتیجے میں امریکہ اور اسرائیل کو اس علاقے میں اپنے منصوبے پورے کرنے کے مواقع حاصل رہیں۔ یہ ایک ایسا سامراجی کھیل ہے جس کے سارے کردار بچشم سر دیکھے جاسکتے ہیں لیکن اس کے باوجود عوام کو دھوکہ دینے کے لیے مختلف ناٹک کیے جا رہے ہیں اور مغربی میڈیا کی پوری قوت ذہنوں کو مسخر کرنے اور اپنے مفید مطلب فضا پیدا کرنے کے لیے استعمال کی جارہی ہے۔ ۱۹۹۱ کی جنگ کے موقع پر تین سفید جھوٹ اس قوت سے اور اس تسلسل سے پھیلائے گئے کہ تمام ذہن مسموم ہو گئے اور جنگ کی فضا بن گئی۔ بعد میں یہ حقیقت سامنے آئی کہ ارادی طور پر محض فضا بنانے اور لوگوں کو مجبور کرنے کے لیے یہ جھوٹ وضع کیے گئے یعنی:

(i) عراق سعودی عرب پر حملہ کرنے کے لیے فوج کشی کر رہا ہے۔

(ii) عراق نیوکلیر پاور بننے والا ہے۔

(iii) عراقی افواج کویت کے ہسپتال سے بچوں کو انکیوبیٹرز (incubators) سے نکال کر لے گئیں اور ہلاک کر ڈالا۔

جنوری ۱۹۹۶ میں برطانیہ کے ٹی وی چینل IV نے The Lies that Made the Gulf War پر ایک دستاویزی فلم بنائی جس میں ان تینوں ارادی اور عمومی جھوٹوں کا پردا چاک کیا اور بتایا کہ کس طرح میڈیا کو جنگ کے لیے استعمال کیا گیا۔ یہ کوئی منفرد واقعہ نہیں، مسلسل یہی کھیل کھیلا جا رہا ہے اور آج بھی اسی طرح جنگی فضا بنانے کی کوشش کی جارہی ہے، البتہ موضوع بدل گیا ہے۔ آج کیمیاوی اور حیاتیاتی اسلحے کا ڈھونگ رچایا جا رہا ہے اور دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ عراق اس پوزیشن میں ہے کہ ساری دنیا کے تمام انسانوں کو گیس اور جراثیم کے ذریعہ ختم کر سکتا ہے۔

ہمیں صدام حسین کی ذات اور عراق کی برسراقتدار جماعت سے کوئی ہمدردی نہیں۔ وہ اسی طرح اس ڈرامے کا ایک کردار ہیں جس طرح بہت سے دوسرے --- لیکن ہماری دلچسپی امت مسلمہ سے ہے، خواہ وہ عراق کی سرزمین پر ہو، باقی عرب دنیا میں ہو یا کرہ ارض میں کسی بھی مقام پر۔ ہم اپنی اس رائے کا اظہار بھی کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے ہمارے پاس مضبوط تاریخی دلائل اور شواہد ہیں کہ گو امریکہ اور اس کی ایجنسیوں نے بارہا بین الاقوامی قانون کی صریح خلاف ورزی کرتے ہوئے دوسرے ممالک کی سیاسی قیادت کو ناجائز ذرائع سے اقتدار سے ہٹایا اور ہلاک تک کیا، جیسے ایران میں ڈاکٹر مصدق اور چلی میں ڈاکٹر سلوا دورالانوے، لیکن صدام حسین کو اقتدار سے ہٹانا ان کا ہدف نہ تھا اور نہ ہے۔ یہ اس لیے کہ صدام کے خطرے کی بنیاد پر وہ پوری عرب دنیا کو بلیک میل کر رہے ہیں اور مزید کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا اصل ہدف مشرق وسطیٰ پر اپنا تسلط اور کنٹرول اور اس علاقے پر اسرائیل کی بالادستی اور علاقے میں کسی ایسی قوت کو نہ

ابھرنے دینا ہے جو اسرائیل کے لیے خطرہ بن سکتی ہو۔ اس فریم ورک میں صدام حسین اور عراق ان کے لیے بڑا مفید مطلب کردار ادا کر رہے ہیں۔ امریکہ کے مشہور رسالے فارن افیرز کا مینجنگ ایڈیٹر جو نیوز ویک کا معاون ایڈیٹر بھی ہے، نیوز ویک میں اس پورے کھیل کی بڑی چشم کشا تصویر گری کرتا ہے۔ پس منظر ہے ۱۹۸۶ میں صدام کی افواج کا عراق کے کرد علاقے میں اقدام، جسے امریکہ اور اقوام متحدہ نے محفوظ علاقہ قرار دیا ہوا ہے اور جس میں امریکہ ایک کرد پارٹی کی دوسروں کے مقابلے میں پشت پناہی کرتا رہا ہے۔ ملاحظہ ہو:

> امریکہ اور صدام حسین کے درمیان تازہ ترین معرکے نے امریکہ کو ایک دفعہ پھر یاد دہانی کرائی ہے کہ صدام ابھی زندہ ہے اور صاحب اقتدار ہے۔ کہا جاتا ہے اس سے خلیجی جنگ کے نامکمل اختتام اور مشرق وسطیٰ میں امریکی ڈپلومیسی کی ناکامی واضح ہوتی ہے۔ کوئی بات بھی سچائی سے اتنی دور نہیں ہو سکتی۔ اگر صدام حسین موجود نہ ہوتا تو ہمیں اسے ایجاد کرنا پڑتا۔ وہ مشرق وسطیٰ میں امریکی پالیسی کا محور ہے۔ اس کے بغیر واشنگٹن صحرا کی ریت میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہوتا۔
>
> خلیج فارس صنعتی دنیا کی رگوں میں دوڑتے ہوئے خون، یعنی تیل کے وسیع ذخائر، سے مالا مال ہے۔ یہ علاقہ امریکہ کے لیے غیر معمولی مفادات کا حامل ہے اور امریکہ سے تعلقات کی ایک تاریخ رکھتا ہے۔ توازن اقتدار کی سادہ سیاست کا تقاضا ہے کہ علاقے میں کسی دشمن ریاست کا غلبہ نہ ہو۔ امریکہ نے چالیس سال سے زائد مدت سے ایسی پالیسی برقرار رکھی ہے، واشنگٹن کی علاقے میں پین عرب ازم کی آڑ میں ۱۹۵۰ میں مصر کی بالادستی کی مخالفت سے لے کر ۱۹۹۱ میں عراق پر حملے کی معکوس پالیسی تک۔
>
> امریکہ کو علاقے کے توازن کے لیے ایک طویل المیعاد پالیسی برقرار رکھنے کی ضرورت ہے، اس لیے اسے بیرونی دنیا میں حلیفوں کی ضرورت ہے اور ملک میں عوامی حمایت کی بھی۔ صدام حسین کی موجودگی دونوں میں بے حد مدد دیتی ہے۔ اگر صدام نہ ہوتا تو سعودی شاہی خاندان جو امریکہ کی زیر تحفظ ریاست ہے (جیسا کہ وہ ایک لحاظ سے اس وقت ہے) خوفزدہ ہو کر امریکی افواج کو اپنی زمین پر آنے کی اجازت دیتا؟ کیا کویت تیس ہزار سے زائد امریکی جماز، ٹینک اور دیگر اسلحہ اپنے ہاں رکھتا کہ شاید ضرورت پڑ جائے؟ کیا اردن کے بادشاہ، جو علاقے کے سیاسی بلوغما ہیں امریکی میرین دستوں کو اپنے ملک کی حدود میں مشقیں کرنے کی اجازت دیتے؟ (نیوز ویک، ۲۱ ستمبر ۱۹۹۶، ص ۱۷)

صدر فورڈ اور صدر بش کے قومی سلامتی کے مشیر برنٹ اسکوکرافٹ نے بھی اپنے انداز میں صدام کی افادیت، ضرورت نیز اسے نہ ہٹانے کی امریکی پالیسی کا اعتراف کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو نیوز ویک، ۲۳ ستمبر ۹۶، ص ۱۹)

اس کھیل کو جاری رکھنے کے لیے وقتاً فوقتاً ہنگاموں، تصادم کے ڈراموں، فوجی نقل و حرکت اور حسب

ضرورت جنگ اور انسانوں کی ہلاکت کی ضرورت ہے اور یہ کھیل پوری بے دردی کے ساتھ کھیلا جا رہا ہے۔ نیز ان خدمات کا معاوضہ بھی پوری ہوشیاری سے وصول کیا جا رہا ہے اور صرف عرب حکومتوں ہی سے نہیں غریب عراقی عوام سے بھی وصول کیا جا رہا ہے۔

امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے ۱۹۹۱ میں کس قوت کے ساتھ عراق پر حملہ کیا تھا اس کا اندازہ اس بات سے لگایئے کہ اس آپریشن میں تین ہزار سے زیادہ لڑاکا طیاروں نے حصہ لیا اور ۵ لاکھ کی فوج ظفر موج میدان میں لائی گئی۔ امریکہ نے اپنی کل عالمی فضائی قوت کا ۷۰ فی صد اور کل ٹینک قوت کا ۴۰ فی صد عراق کی "چڑیا" کو مارنے کے لیے استعمال کیا۔ امریکہ نے ویت نام میں ساڑھے آٹھ سال میں ۶۸ ہزار ٹن بم گرائے جبکہ عراق کے خلاف ۴۳ دن میں ایک لاکھ چھ ہزار ٹن ــــــ اور اس طرح عراق کو ایک مقبوضہ ملک بنا ڈالا۔ خلیجی جنگ کے بعد سے اب تک عراق کے ۱۲ لاکھ افراد جنگ یا جنگ کے بعد کے حالات کی وجہ سے جن میں تادیبی کارروائیاں (sanctions) شامل ہیں، ہلاک ہو چکے ہیں۔ ۵ سال سے کم عمر کے بچے جن کی وفات کی شرح ۱۹۹۱ سے پہلے ۵ سو فی مہینہ تھی اب ۶ ہزار ۵ سو فی مہینہ ہے اور ۵ سال سے بڑے بچوں کی موت کی شرح ۲۶ سو ماہانہ سے بڑھ کر ۱۸ ہزار ماہانہ ہو گئی ہے۔ اگر یہ مسلسل نسل کشی (genocide) نہیں تو اور کیا ہے؟

عراق کے اسلحے کے خفیہ ٹھکانوں کی دریافت بھی ایک ہوش ربا اسکینڈل ہے۔ اس تلاش کو اب ساتواں سال ہے۔ ساڑھے چار سو سے زیادہ انسپکٹر اس کام پر مامور ہیں (واضح رہے کہ عراق نے ان ۴۵۰ میں سے صرف ۱۴ کو امریکہ اور برطانیہ کا جاسوس ہونے کے الزام میں نکل جانے کے لیے کہا تھا اور پھر ہوائی تادیبی حملوں کی دھمکی کے بعد دوبارہ کام شروع کرنے دیا)۔ ساتواں سال ہے اور یہ انسپکٹر اپنا کام مکمل نہیں کر پائے۔ اس عرصے میں یہ عراق کی نیوکلیر استعداد کو ختم کر چکے ہیں، ۳۶ ہزار کیمیکل بم اور آرٹلری شیل، ۶۹۰ ٹن کیمیکل ایجنٹ اور ۸۱۹ میں سے ۸۱۷ اسکڈ میزائل تباہ کر چکے ہیں۔ مختلف صنعتی پلانٹوں کی مکمل تباہی اس کے علاوہ ہے۔ ایک انسپکٹر نے اس ادارے یعنی United Nations Special Commission on Iraq (UNSCI) کے بارے میں صحیح اعتراف کیا ہے کہ اس کے ذریعے ہم عراق پر فاصلاتی کنٹرول (remote control) سے قبضہ کیے ہوئے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ایک ملک کب تک اس طرح کے قبضے کو برداشت کر سکتا ہے؟

یہاں اس بات پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ امریکہ کس طرح اس معاملے میں بھی دوغلے معیار پر کاربند ہے۔ عراق کو اس کمیشن پر اس کے لاقانونی کردار کے علاوہ دو اعتراض ہیں۔ ایک یہ کہ یہ انسپکٹر عراق کی سیاسی حاکمیت اور اس کے حکمرانوں کی عزت و وقار کو بھی پاؤں میں روندنے پر مصر ہیں اور اس بے عزتی کی کوئی حد نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ ان انسپکٹروں میں اکثریت امریکہ اور برطانیہ کے لوگوں کی ہے جن

کی عراق دشمنی ایک کھلی حقیقت ہے اور جن سے کسی غیر جانب دار تحقیق کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اصولاً دونوں اعتراض قابل لحاظ ہیں اور یہی وجہ ہے کہ فرانس' روس اور چین نے ان کو وزنی اعتراض قرار دیا ہے اور کمیشن کے سربراہ کے غیر ذمہ دارانہ بیانات پر' جن میں یہ بھی شامل ہے کہ عراق چاہے تو تل ابیب کو کیمیکل بم سے اڑا سکتا ہے' اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ خود اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کوفی عنان نے اس پر تشویش کا اظہار کیا ہے۔ لیکن امریکہ مصر ہے کہ وہ بیک وقت پولیس مین' وکیل اور جج کا کردار ادا کرے گا۔ لیکن امریکہ کے دوغلے پن کا پردا اس قانون نے چاک کر دیا ہے جو ابھی ابھی امریکی سینیٹ نے منظور کیا ہے۔ امریکہ نے کیمیاوی ہتھیاروں کی کنونشن (CWC) پر دستخط کر دیے ہیں (پاکستان نے بھی کسی قومی بحث و گفتگو اور پارلیمنٹ اور قوم کو اعتماد میں لیے بغیر اس پر دستخط کر دیے ہیں)۔ اس کنونشن کی رو سے عالمی ادارے کے انسپکٹر شکایت ملنے پر دو ہفتے کے اندر اندر متعلقہ مقامات کا معائنہ کر سکتے ہیں۔ لیکن امریکہ کا رویہ یہ ہے کہ اس کنونشن کی سینیٹ کی طرف سے توثیق کے بعد بیس مواقع پر معائنے کی جو کوشش ہوئی ہے اس میں دو انسپکٹرز کو امریکہ نے معائنہ نہیں کرنے دیا حالانکہ ان کا تعلق ہیگ کی بین الاقوامی تنظیم Organisation for the Prohibition of Chemical Weapons سے تھا۔ اعتراض یہ تھا کہ ان میں سے ایک انسپکٹر کا تعلق ایران سے تھا اور دوسرے کا کیوبا سے۔ اگر امریکہ کو یہ اختیار ہے کہ عالمی ادارے کے انسپکٹرز کو ویٹو کر دے تو عراق یا کسی دوسرے ملک کو یہ اختیار کیوں حاصل نہ ہو۔

اس سے بھی بڑھ کر قابل اعتراض' زیر منظوری قانون کی دفعہ ۳۰۷ ہے جس کی رو سے امریکہ اپنے لیے یہ اختیار حاصل کرنا چاہتا ہے کہ امریکہ اپنی قومی سلامتی کے نام پر جس جگہ کے معائنے کو روکنا چاہے' روک دے۔ قانون یہ اختیار امریکہ کے صدر کو دے رہا ہے اور یہ بھی قانون میں لکھا جا رہا ہے کہ اس قانون کو کسی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ متعلقہ دفعات یہ ہیں:

> صدر' امریکہ میں کسی سہولت کے معائنے کی درخواست کو مسترد کر سکتا ہے' اگر صدر یہ فیصلہ کرے کہ یہ معائنہ امریکہ کے قومی سلامتی کے مفادات کے لیے خطرہ ثابت ہو سکتا ہے۔

ایک دوسری دفعہ میں یہ لکھا گیا ہے:

> انسپکٹر کی حیثیت سے کام کرنے والے کسی فرد پر صدر کا اعتراض کسی عدالت میں زیر بحث نہیں لایا جا سکتا۔

روزنامہ گارڈین نے اداریے میں تبصرہ کرتے ہوئے اسے معائنے کے دوغلے معیار (double standards for inspection) قرار دیا ہے اور صاف الفاظ میں کہا ہے کہ صرف صدام حسین ہی قاعدہ قانون سے نہیں کھیل رہا' امریکہ بھی یہی کچھ کر رہا ہے۔ (Saddam Hussain is not the only one

stretching the rules)

اس دوغلے پن کے ساتھ کون امریکہ کی اخلاقی پوزیشن کا دفاع کر سکتا ہے؟

تمھاری زلف میں پہنچی تو حسن کہلائی
وہ تیرگی جو مرے نامہ سیاہ میں ہے

ایک بڑا بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا امریکہ، برطانیہ یا کسی اور ملک کو یہ اختیار حاصل ہے کہ اقوام متحدہ کے نام پر جب چاہے عراق پر چڑھ دوڑے۔ یہ کھیل سات سال سے جاری ہے لیکن اب اس جارحیت کا پردا چاک ہو چکا ہے۔ سلامتی کونسل کی قرارداد ۶۸۷ میں اسلحے کے ذخیروں کے معائنے کا ذکر ہے لیکن اس سلسلے میں قوت کے استعمال کی کوئی اجازت موجود نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ برطانیہ اس سلسلے میں نئی قرارداد لانا چاہتا ہے مگر امریکہ تیار نہیں کہ کہیں روس، چین یا فرانس اسے ویٹو نہ کر دیں۔ یہ صاف اعتراف ہے اس امر کا کہ معائنے کے مسئلے پر قوت کا استعمال بلا قانونی یا اخلاقی جواز ہے۔ اس مسئلے کے بارے سلامتی کونسل کے مستقل ارکان کے درمیان بھی اتفاق نہیں۔ باقی دنیا بھی اس کی مخالف ہے۔ لیکن امریکہ اپنی من مانی کرنے پر تلا ہوا ہے اور پوری عالمی برادری کے اعتراض کو پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہیں دے رہا اور ڈھٹائی کا یہ عالم ہے کہ صدر کلنٹن نے کئی بار کہا ہے اور اپنے اس سال کے State of the Nation خطاب میں بھی اس کا اعادہ کیا ہے کہ "اگر صدام عالمی برادری کی متفقہ رائے پر نہیں چلتا تو ہم اس کو سزا دینے کے لیے تیار ہیں اور ہم یہ کر کے رہیں گے"۔ اس مسئلے پر امریکہ اور برطانیہ کے علاوہ سارے ملک قوت کے استعمال کے خلاف ہیں۔ روس نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اگر امریکہ یک طرفہ کارروائی کرتا ہے تو تیسری جنگ عظیم کا خطرہ مول لے گا۔ روس کی پارلیمنٹ (ڈوما) نے باقاعدہ قرارداد منظور کی ہے۔ نیز صدر بورس یلسن نے اٹلی کے ایک اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا ہے کہ:

> تاریخ بتاتی ہے کہ عالمی بالادستی قائم کرنے کی کوششیں ہمیشہ مختصر المیعاد ہوتی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ پرانی عادتوں کے خلاف کام آسان نہیں ہوتا، مگر مجھے یہ کہنا ہے کہ بعض ممالک کی یہ کوشش کہ دنیا پر یک قطبی ماڈل (unipolar model) مسلط کیا جائے اور دنیا کا قائد بن جایا جائے، غیر حقیقت پسندانہ بلکہ خطرناک ہے۔ (دی گارجین، ۹ فروری ۱۹۹۸، ص ۱۱)

عرب لیگ ۲۲ عرب ممالک کی ترجمان ہے، اس کے سیکرٹری جنرل نے نہ صرف یہ کہ فوجی اقدام کی مخالفت کی ہے بلکہ اسے امریکہ کی ضد اور ہٹ دھرمی قرار دیا ہے۔ انگلستان کے بیشتر قومی اخبارات نے برطانوی حکومت کی پالیسی پر تنقید کی ہے اور اسے امریکہ کے آگے ہتھیار ڈالنے کے مترادف قرار دیا ہے۔ ۱۹۹۱ کی خلیجی جنگ کے امریکی اور برطانوی جرنیلوں نے اسے خطرناک اور غیر مفید (unproductive) قرار

دیا ہے اور کہا ہے کہ بجز معصوم انسانوں کے خون بہانے کے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ امریکہ کے عسکری اہداف کو مبہم اور "Fuzzy Symbolism" (دی انڈی پنڈنٹ' ۱۲ فروری ۹۸) قرار دیا ہے۔ دانش ور اسے خالص سامراجی کھیل قرار دے رہے ہیں۔ ادیب اور دانش ور ہیرالڈ پنٹر (Harold Pinter) اور کارڈی نل باسل ہیوم نے سخت الفاظ میں تنقید کی ہے۔ پنٹر کے الفاظ نقل کرنے کے لائق ہیں:

امریکہ ایک عفریت بن گیا ہے۔ در حقیقت ضرورت یہ ہے کہ امریکہ کو روک دیا جائے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ جنگ بہت ہولناک ہے لیکن جو بات ہم نظرانداز کر دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ اسے اب غیر حقیقی اور خیالی بنا دیا گیا ہے اور اس حد تک غیر معتر بنا دیا گیا ہے (it has been abstracted now and sanitized to such an extent) کہ مسٹر کلنٹن نے بچوں کو قتل کیا ہے اور انھیں اس کی بالکل پروا بھی نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ بھی در حقیقت غیر حقیقی اور خیالی ہیں! یہ بچے وہ ہیں جو ان کی لگائی ہوئی پابندیوں کی وجہ سے مر رہے ہیں۔ بین الاقوامی برادری کی یک جہتی کے مسلسل حوالے دیے جاتے ہیں لیکن یہ امریکہ ہے جو اتنی طویل مدت سے بین الاقوامی قانون کی تحقیر کر رہا ہے (held in contempt) کہ وہ اس تصور ہی کو بے معنی کر دینے میں کامیاب ہے۔ امریکہ اب ایک ایسا بے مغز عفریت ہے جو قابو سے باہر ہے۔ (دی انڈی پنڈنٹ' ۱۳ فروری ۹۸)

درجنوں اہل قلم اور سیاسی مبصرین امریکہ کے اس خونی کھیل کی مذمت کر رہے ہیں اور انسانیت کے ضمیر کو اس کے خلاف بغاوت کی دعوت دے رہے ہیں۔

عراق پر اس چڑھائی کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ اسے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی قراردادوں کی تنفیذ کے نام پر کیا جا رہا ہے گو ان قراردادوں میں قوت کے استعمال کی اجازت کا کہیں ذکر نہیں۔ لیکن اگر اسے نظرانداز بھی کر دیا جائے تو سوال یہ ہے کہ کیا سلامتی کونسل کی قراردادوں کا تعلق صرف عراق سے ہے؟ کیا اسرائیل کے بارے میں جو قراردادیں ہیں وہ صرف تبرک کے لیے ہیں اور ان کی تنفیذ کی کوئی ضرورت نہیں۔ اسرائیل ایک نہیں کئی درجن قراردادوں کی پوری ڈھٹائی کے ساتھ کھلی کھلی خلاف ورزی کر رہا ہے اور امریکہ اس کی پشت پناہی کر رہا ہے۔ کیا سلامتی کونسل کی قرارداد ۲۴۲ قابل تنفیذ نہیں؟ کیا سلامتی کونسل نے چالیس سے زیادہ قراردادیں فلسطین میں غیر قانونی آباد کاریوں (settlements) کے بارے میں منظور نہیں کیں؟ ان پر عمل کیوں نہیں ہو رہا؟ کیا یہ ایک حقیقت نہیں کہ ۱۹۹۷ میں جنرل اسمبلی نے تین بار اسرائیل کے بیت المقدس میں نئے مکانات تعمیر کرنے کے خلاف صرف ایک ووٹ کی مخالفت سے (یعنی اسرائیل کا واحد ووٹ' امریکہ بھی ان قراردادوں کے بارے میں غیر جانب دار رہا) گویا تقریباً متفقہ طور پر یہ قراردادیں منظور کیں لیکن اسرائیل نے ان پر عمل کرنے سے بڑے حقارت آمیز انداز میں انکار کر دیا۔ کوئی

نہیں جو اسرائیل سے ان قراردادوں پر عمل کرا سکے۔ کیا بھارت کشمیر کے بارے میں سلامتی کونسل کی تین واضح قراردادوں کی کھلی خلاف ورزی نہیں کر رہا؟ کیا بوسنیا میں اقوام متحدہ کے محفوظ علاقے مقرر کیے جانے کے بعد سربوں پر اس کی قراردادوں کو نافذ کیا گیا؟ کیا آج بھی جنگی قیدیوں کے بارے میں سلامتی کونسل کی قراردادوں پر امریکہ اور نیٹو کی فوج کی موجودگی میں کوئی عمل ہو رہا ہے؟ کیا اقوام متحدہ کی قراردادیں صرف عراق ہی کے لیے ہیں؟ آخر اس کھلے کھلے دوغلے پن کے بعد امریکہ کے موقف میں کیا اخلاقی یا قانونی وزن باقی رہتا ہے۔ لندن کے اخبار آبزرور نے ادارتی تبصرے میں صحیح کہا ہے کہ: "اس میں یہ مضمر ہو گا کہ اسرائیل بھی اقوام متحدہ کی قراردادوں کی تعمیل کرے"۔

مصر کے مشہور اخبار الاھرام نے بھی اس حقیقت کو بہت صاف الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:

> علاقے میں موجود کش مکش کا الزام عراق پر نہیں اسرائیل پر رکھا جانا چاہیے۔ ہر دفعہ جب امریکہ عراق پر چڑھ دوڑتا ہے' اور اسرائیل کے' جس نے عرب ریاستوں پر قبضہ کر رکھا ہے' کیمیائی اور حیاتیاتی اسلحے کو نظرانداز کرتا ہے' اس کا دوہرا معیار کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ اگر امریکہ نے عراق کے خلاف جارحیت کا ارتکاب کیا تو علاقے میں امریکہ کی جو کچھ ساکھ رہ گئی ہے وہ اسے بھی کھو دے گا۔
> (بحوالہ مڈل ایسٹ انٹرنیشنل' لندن ۱۳ فروری ۹۸' ص ۵)

حقیقت صرف یہی نہیں ہے کہ اسرائیل کے بارے میں امریکہ خاموش ہے بلکہ یہ سارا کھیل اسرائیل ہی کو علاقے کی بالاترین قوت بنانے کے لیے کھیلا جا رہا ہے۔ گذشتہ ۲۰ سال سے امریکہ ہر سال اسرائیل کو ۲.۱ بلین ڈالر معاشی امداد (قرض نہیں' صاف صاف امداد) اور ۱.۸ ارب ڈالر فوجی امداد دے رہا ہے یعنی ۳ بلین ڈالر۔ یہ اس وقت ہے کہ جب ساری دنیا کے غریب ملکوں کی بیرونی امداد بند ہو گئی ہے یا سودی قرضوں میں تبدیلی کر دی گئی ہے حالانکہ اسرائیل علاقے کے امیر ترین ممالک میں سے ہے اور اس کی سالانہ قومی آمدنی ان ۲۰ سالوں میں ۲۰ ارب ڈالر سے بڑھ کر ۹۸ ارب ڈالر سالانہ ہو گئی ہے جس کا ۲۰ فی صد وہ جنگی تیاریوں پر خرچ کر رہا ہے۔ آیندہ سال کے لیے امریکہ نے وعدہ کیا ہے کہ اسرائیل کی سالانہ فوجی امداد ۱.۸ ارب ڈالر سے بڑھا کر ۲.۴ ارب ڈالر کر دی جائے گی۔

ایک طرف اسرائیل پر یہ عنایات ہیں اور دوسری طرف اسرائیل کا یہ حال ہے کہ اقوام متحدہ کی قراردادوں ہی کی دھجیاں نہیں بکھیر رہا' خود اوسلو معاہدہ میں جو وعدے امریکہ سے کیے ہیں ان کا کم سے کم حصہ بھی پورا کرنے کو تیار نہیں ہے۔ معاہدے کے مطابق اب تک دریائے اردن کے مغربی حصے کا ۳۰ فی صد فلسطینی مقتدرہ کو مل جانا چاہیے تھا لیکن عملاً صرف اڑھائی فی صد حصہ ملا ہے اور مزید دینے پر اسرائیل تیار نہیں۔ اس کے خلاف کسی تادیبی کارروائی کی کوئی بات بھی کرنے کو تیار نہیں بلکہ اس کی ہر ہٹ دھرمی کے جواب میں امریکہ یہی یقین دہانی کرا رہا ہے کہ ہم تمھاری پشت پر ہیں۔

یہ ہے عالمی طاقتوں کا کردار مگر عرب دنیا اور مسلمان امت کی قیادت کا حال یہ ہے کہ اب بھی ان کی آنکھیں نہیں کھلیں اور وہ امریکہ ہی سے اپنی ساری امیدیں لگائے بیٹھے ہیں۔

حالات کے اس جائزے سے سامراجی قوتوں کے اصل کھیل کے خدوخال بالکل واضح ہو جاتے ہیں۔ ان سے کسی خیر کی توقع رکھنا عبث ہے۔ سوال یہ ہے کہ امت مسلمہ کو اس صورت حال کا مقابلہ کس طرح کرنا چاہیے؟ کیا ان قوتوں کے آگے ہتھیار ڈال دیں؟ کیا اپنے ایمان اور زندگی کے مقاصد کو قربان یا فراموش کر دیں؟ اور نئی غلامی کی ان زنجیروں کو بہ رضا و رغبت پہن لیں؟ یا جس طرح ماضی میں باطل قوتوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا ہے، آج بھی اسی طرح ایک بار پھر صف آرا ہو جائیں اور اللہ کے بھروسے پر اپنے ایمان، اپنے دین، اپنی عزت اور اپنے مستقبل کی خاطر، ہر محاذ پر اور بالآخر عالمی سطح پر، انتفاضہ کا راستہ اختیار کریں۔

جوئے خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
آستان یار سے اٹھ جائیں کیا؟

آزادی، زندگی اور عزت کا یہی ایک راستہ ہے اور تاریخ کا فیصلہ ہے کہ کمزور اور مغلوب ہمیشہ اس طریقے پر عمل پیرا ہو کر ظالموں کے چنگل سے نکلے ہیں اور تاریخ کا رخ بدل گیا ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ کوئی سوپر پاور ہمیشہ کے لیے سوپر پاور نہیں رہ سکتی--- ہر ایک کے اقتدار کے دن محدود ہیں۔ تاریخ کم از کم ۲۶ سوپر پاورز کا قبرستان ہے اور کم از کم دو عالمی قوتوں (برطانیہ اور روس) کو تو ہم نے اپنی زندگی میں سوپر پاور سے گر کر بے بال و پر ہوتے دیکھا ہے۔ ضرورت اپنے مقاصد کے صحیح تعین اور ان کے لیے صبر آزما جدوجہد کی صحیح منصوبہ بندی کی ہے۔ برزنسکی عالم اسلام میں امریکہ کے مستقبل کے رول کے بارے میں کہنے پر مجبور ہوا کہ:

تاہم اس غلبے کے نہایت سطحی رہنے بلکہ بکھر جانے کا امکان ہے اس لیے کہ امریکہ اور اس کی حاشیہ نشین عرب ریاستوں کے درمیان مشترک اقدار، سیاسی کلچر یا مذہب کے کوئی دیرپا بندھن نہیں ہیں۔ امریکی اقتدار بیشتر مقامی حکومتوں سے طفیلیانہ تعلق پر مبنی ہے جو اکثر بدعنوان اور بدنما (obscenely) دولت مند طبقے کی ہیں اور خود اپنے ہی عوام سے ان کا رابطہ ٹوٹ جانے کا اندیشہ روز افزوں ہے۔ ایسی صورت میں کہ مذہب اور قومیت دونوں ایک اجنبی طاقت کی علاقائی بالادستی کے خلاف ایک ہیں، مشرق وسطی میں امریکہ کی موجودہ بالادستی کی تعمیر، لفظ کے حقیقی مفہوم میں، بالکل ریت پر ہے۔ اگر عرب اسرائیل تنازعے کو حل کرنے کی امریکی کوششیں ناکام ثابت ہوں تو امریکہ کے لیے عربوں کی مخالفت کا بڑھنا بھی یقینی ہے۔ اسرائیل کے لیے امریکی حمایت کو امریکہ کے اپنے مفادات اور یہودی عوام کے ساتھ اپنی اخلاقی ذمہ داری کا آئینہ دار سمجھا جا سکتا ہے، لیکن یک طرفہ امریکی جھکاؤ کی صورت

میں' عرب اسرائیل تنازع کے پرامن اختتام کی کوششوں میں ناکامی سے امریکہ کی مسلسل علاقائی بالادستی کے خلاف مذہبی بنیاد پرستی اور قوم پرستانہ انتہا پسندی کے مضبوط ہونے کا امکان ہے۔
(Out of Control' ص ۱۴۲-۱۴۳)

امت مسلمہ کے لیے نجات کا واحد راستہ اپنے گھر کی اصلاح اور درستی میں ہے۔ اللہ پر ایمان اور بھروسہ' عوام کی بیداری' ان کے حقوق کے تحفظ کی جنگ اور سامراجی غلبے اور آمرانہ نظام حکومت کے خلاف عوامی انتفاضہ وہ ہتھیار ہیں جن سے بڑی بڑی جابر قوتوں کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ مسئلہ' ایک عراق پر امریکی پوزیشن کا نہیں' پوری اسلامی دنیا پر سامراجی تسلط کا ہے اور اس میں صرف باہر کی قوتیں کارفرما نہیں' اندر کے لوگ بھی شریک ہیں۔ بہ یک وقت دونوں کا مقابلہ ہی ہماری آزادی اور دین و ایمان کا ضامن ہو سکتا ہے۔ اس لیے جہاں یہ ضروری ہے کہ اصل خطرات کا صحیح ادراک کیا جائے' اس کھیل کے تمام اداکاروں کو پہچانا جائے' وہیں یہ بھی ضروری ہے کہ ان کا مقابلہ کرنے کے لیے ایمان کی قوت کی آبیاری' عوامی قوت کی تنظیم اور مسلسل جدوجہد کی منصوبہ بندی کی جائے اور فوری نتائج کے خواب دیکھنے کے بجائے زندگی کے ہر محاذ پر ٹھوس اور دیرپا جہاد کا راستہ اختیار کیا جائے۔ بلاشبہ مسلمان عوام کو امریکہ اور مغربی اقوام کی اس یلغار پر احتجاج بھی کرنا چاہیے اور اپنی حکومتوں کو شرم دلانی چاہیے کہ وہ ان حالات میں محض خاموش تماشائی نہ بنے رہیں۔ افسوس کا مقام ہے کہ مغرب کے کچھ دانش ور' ادیب اور سیاست دان تو امریکہ کے خلاف احتجاج کی آواز اٹھا رہے ہیں لیکن مسلم ممالک کی تنظیم (او آئی سی) خواب غفلت میں مگن ہے۔ مسلمان اور عرب حکمرانوں میں سے کچھ صرف دبی زبان سے معذرت خواہانہ انداز میں کچھ کلمات ادا فرما رہے ہیں جبکہ کچھ دوسروں کا حال یہ ہے کہ ۔

پہلے تو آ کے شیخ نے دیکھا ادھر ادھر
پھر سر جھکا کے داخل مے خانہ ہو گیا!

احتجاج اور احتساب وقت کی اولین ضرورت ہیں لیکن حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے کافی نہیں۔ اصل جواب عوامی بیداری اور حق کے لیے جہاد اور انتفاضہ ہے اور اس کے لیے کمربستہ ہونا وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے ۔

یا مردہ ہے یا نزع کی حالت میں گرفتار
جو فلسفہ لکھا نہ گیا خونِ جگر سے

استحکام پاکستان کی واحد صورت

سید مودودیؒ نے چراغ راہ کے نظریہ پاکستان نمبر کے لیے ایک تفصیلی انٹرویو دیا تھا۔ اس وقت پاکستان، مشرقی اور مغربی پاکستان پر مشتمل، اسلامی دنیا کی سب سے بڑی مملکت تھی۔ یہ سید مودودیؒ کی دور اندیشی اور فراست تھی کہ انھوں نے، ملکی سلامتی کو درپیش جن خطرات کی نشان دہی کی تھی، سانحہ مشرقی پاکستان کے بنیادی محرکات وہی ثابت ہوئے۔ آج مزید پچیس برس بیتنے کے بعد ایک بار پھر شدت کے ساتھ صوبائیت، علاقائیت اور لسانیت کے بلند ہوتے ہوئے نعرے اور حکمرانوں کی عاقبت نااندیشی، ملک کی یک جہتی و سلامتی کے لیے خطرہ بنتے محسوس ہو رہے ہیں۔ ایسے میں ملک کی بقا صرف اور صرف اسلامی نظریے ہی سے وابستہ ہے۔ ہم مذکورہ انٹرویو سے چند اقتباسات پیش کر رہے ہیں جن کی سچائی آج بھی تازہ ہے اور مسائل کا حقیقی حل پیش کرتی ہے۔ (مدیر)

☆ آپ کی نگاہ میں پاکستان کے بقا اور استحکام کے لیے اسلامی نظریہ کی ضرورت اور اہمیت کیا ہے؟

○ پاکستان کے بقا و استحکام کے لیے اسلامی نظریہ کی اولین ضرورت و اہمیت یہ ہے کہ ہم مسلمان ہیں۔ اگر ایک مسلمان قوم کا نظریہ اسلامی نہ ہو تو اور کیا ہو سکتا ہے۔ مسلمان ہونے کے تو معنی ہی یہ ہیں کہ ہمارے خیالات اسلامی ہوں۔ ہمارے سوچنے کا انداز اسلامی ہو۔ معاملات پر ہم اسلامی نقطہ نظر ہی سے نگاہ ڈالیں اور اپنی تہذیب، تمدن، سیاست، معیشت اور فی الجملہ اپنے پورے نظام زندگی کو اسلام کے طریقے پر چلائیں۔ اگر ہم ایسا نہ کریں تو آخر کس بنا پر ہم اپنے آپ کو مسلمان کہنے کے حق دار ہو سکتے ہیں۔ مسلمان ہونے کا دعویٰ بھی کرنا اور پھر اپنی زندگی کے مختلف گوشوں میں کسی غیر اسلامی نظریے پر کام بھی کرنا لازماً یہ معنی رکھتا ہے کہ یا تو ہم منافق ہیں اور دل سے مسلمان نہیں ہیں، یا پھر ہم جاہل ہیں اور اتنا شعور بھی نہیں رکھتے کہ مسلمان ہونے کے کم سے کم منطقی تقاضے کیا ہیں؟

دوسری چیز، اس سلسلے میں یہ ہے کہ ہم نے متحدہ ہندستان میں سے پاکستان کے نام کا ایک الگ خطہ زمین کاٹ کر حاصل کرنے کے لیے جو لڑائی لڑی تھی، وہ تمام دنیا کے سامنے ڈنکے کی چوٹ پر یہ کہہ کر لڑی تھی کہ ہم ایک جداگانہ تہذیب و تمدن رکھنے والی قوم ہیں۔ متحدہ ہندستان میں غیر مسلم اکثریت کے ساتھ

ایک مشترک نظام زندگی ہم نہیں بنا سکتے۔ ہمیں اپنے نظام زندگی کے مطابق کام کرنے کے لیے ایک الگ علاقہ چاہیے جہاں ہم اپنی تہذیب اور اپنے تمدن اور اپنے قوانین حیات کے مطابق کام کر سکیں۔ اب ایک سخت لڑائی لڑنے کے بعد جب وہ پاکستان ہمیں حاصل ہو گیا جس کے لیے ہم نے یہ سارے پاڑ بیلے تھے تو یہ ایک بالکل عجیب حرکت ہو گی کہ ہم یہاں اسی تہذیب و تمدن اور نظام زندگی سے منہ موڑلیں جس کا ہم نے نام لیا تھا اور وہی سب کچھ کرنا شروع کر دیں جو متحدہ ہندستان میں بھی با آسانی کیا جا سکتا تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم تمام دنیا کے سامنے اپنے آپ کو ایک جھوٹی اور مکار' یا احمق اور فضول قسم کی قوم کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ آخر دنیا یہ نہ سوچے گی کہ یہ عجیب قوم ہے کہ جس مقصد کا نام لے کر یہ لڑی تھی' لڑائی میں کامیاب ہو کر اسی مقصد کو فراموش کر بیٹھی اور جو کام یہ لڑے بغیر کر سکتی تھی' وہی اس نے جان و مال اور آبرو کے بے شمار نقصانات اٹھانے کے بعد کرنا شروع کر دیا۔ ہماری سوسائٹی میں جن باتوں پر بے چارے سکھوں کا مذاق اڑایا جاتا ہے' ہماری یہ حرکت اس سے بدرجہا زیادہ بڑھی ہوئی ہو گی اور دنیا کے سامنے ہم اپنے آپ کو "مہاسکھ" کی حیثیت سے پیش کریں گے۔

تیسری چیز' اس سلسلے میں یہ ہے کہ پاکستان مختلف عناصر سے مرکب ہے اور جن عناصر سے یہ مرکب ہے' ان کے درمیان آج تک اپنی جداگانہ خصوصیات نمایاں طور پر موجود ہیں۔ ان کے اندر حقیقت میں کوئی امتزاج ایسا نہیں ہو سکا ہے جو ان عناصر کو بالکل یک جان اور یک رنگ کر چکا ہو۔ ان کی زبانیں مختلف ہیں۔ لباس' عادات' طرز معاشرت مختلف ہے۔ نسلیں مختلف ہیں۔ ایک بڑی حد تک ان کے مفاد بھی نہ صرف مختلف بلکہ متصادم ہیں۔ ان کے اندر جدا جدا ہونے کا احساس نہ صرف موجود ہے بلکہ زندہ اور متحرک ہے اور ایک ذرا سے اشارے پر بہ آسانی ابھر آتا ہے اور سب سے زیادہ یہ کہ پاکستان جغرافیائی حیثیت سے ایک وطن بھی نہیں ہے۔ اس کے دو بڑے ٹکڑے' جن میں اس کی آبادی تقریباً نصف نصف بٹی ہوئی ہے' ایک دوسرے سے ہزار میل کے فاصلے پر ہیں اور بیچ میں ایک ایسی طاقت حائل ہے جس کے ساتھ ہمارے کچھ بہت اچھے تعلقات بھی نہیں ہیں۔ کسی وقت بھی ان تعلقات کی خرابی کی وجہ سے ان دونوں ٹکڑوں میں مواصلات کے سارے رشتے کٹ سکتے ہیں۔ اس حالت میں پاکستان کو ایک وحدت بنا کر رکھنے والی قوت سوائے اسلام کے کوئی نہیں ہے۔ محض سیاسی نظام کی وحدت کوئی چیز نہیں۔ کیا اسی طرح کی وحدت آسٹریا اور ہنگری میں نہ تھی؟ کیا اسی طرح کی وحدت عثمانی سلطنت میں نہ تھی؟ کیا اسی طرح کی وحدت برٹش ایمپائر میں نہ تھی؟ اس وحدت کے بل پر مختلف الجنس عناصر کو ایک "بنیان مرصوص" نہیں بنایا جا سکتا۔ اس کے لیے زبان کی وحدت مددگار ہو سکتی ہے مگر اس کا یہاں دور دور کوئی امکان نہیں۔ اس

کے لیے معاشی مفاد کی وحدت بھی مددگار ہو سکتی ہے لیکن ایک اندھا بھی دیکھ سکتا ہے کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان یہ موجود نہیں ہے۔ اب سوائے ایک عقیدے اور دین کی وحدت اور اصول اخلاق و تہذیب کی وحدت کے اور کیا ایسی چیز ہے جو پاکستان کے مختلف عناصر کو جوڑ کر رکھ سکتی ہو؟

چوتھی اور آخری چیز' یہ ہے کہ ملک کی عظیم مسلم اکثریت' جو دراصل پاکستان کی بانی اور اس کی پشت پناہ ہے' سچے دل سے یہ ایمان رکھتی ہے کہ اس کی زندگی کے مسائل کا حل فی الواقع اسلامی نظام ہی میں ہے اور اس نظام سے بہتر کوئی دوسرا نظام نہیں ہے۔ جن لوگوں کا اصلی عقیدہ یہ نہیں ہے' جو محض مسلمان گھرانوں میں پیدا ہو جانے کی وجہ سے مسلمان بنے ہوئے ہیں مگر اپنے عقائد اور خیالات اور نظریات کے اعتبار سے غیر مسلم ہو چکے ہیں' ان کا معاملہ تو دوسرا ہے۔ وہ تو بلاشبہ یہی چاہیں گے کہ ہم اپنے ساتھ بس مسلمان کا نام لگائے رکھیں مگر کام کسی غیر اسلامی نظریے پر کریں۔ لیکن ایسے لوگ آخر ہماری آبادی میں ہیں کتنے؟ مشکل سے ان کا تناسب ایک دو یا دس پانچ فی لاکھ ہو گا۔ آخر عقل و منطق' یا انصاف یا جمہوریت کے کس قاعدے سے اس چھوٹی سی اقلیت کو یہ حق پہنچتا ہے کہ یہاں کوئی نظام زندگی اس کے نظریات کے مطابق اختیار کیا جائے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ اس وقت یہی چھوٹی سی اقلیت ہمارے ہاں بڑے بڑے مناصب پر مسلط رہی ہے۔ لیکن یہ حالت خواہ کتنی ہی پریشان کن ہو' بہرحال اسے کوئی حقیقی اہمیت حاصل نہیں ہے۔ اس لیے کہ ملک میں ایسی ایک اقلیت کے برسراقتدار ہونے کی حیثیت ایک اجنبی قوم کے برسر اقتدار ہونے سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ انگریز بھی جب اس ملک پر حکومت کر رہا تھا تو اس کے کارفرماؤں اور کارپردازوں کی تعداد اس ملک میں اس سے زیادہ نہ تھی۔ اگر وہ اجنبی اقتدار یہاں مستحکم نہ ہو سکا تو یہ اجنبی اقتدار بھی یہاں مستحکم نہیں ہو سکتا۔ جب تک یہ اقتدار یہاں مسلط رہے گا' پاکستان کے باشندوں کی عظیم اکثریت کے جذبات' احساسات اور ان کی گہری جڑوں پر جمی ہوئی روایات سے' اس چھوٹی سی اقلیت کے منصوبے پیہم متصادم ہوتے رہیں گے۔ تصادم کی وجہ سے یہ ملک ایک انچ بھی ترقی کے راستے پر آگے نہ بڑھ سکے گا بلکہ جو کچھ پہلے کا بنا ہوا ہے وہ بھی بگڑتا چلا جائے گا۔ قوم کا دلی تعاون جس طرح بدیسی اجنبیوں کو کبھی حاصل نہ ہو سکا' اسی طرح ان دیسی اجنبیوں کو بھی کبھی حاصل نہ ہو سکے گا۔ ان کی حیثیت بالکل ایسی ہی رہے گی جیسے کوئی شخص ایک ایسے گھوڑے پر سوار ہو جو اسے سواری نہ دینا چاہتا ہو اور سوار اور سواری میں مسلسل کش مکش جاری رہے۔ اس حالت میں کسی نظریے کے مطابق بھی ہماری زندگی کے کسی مسئلے کا حل نہ ہو سکے گا' نہ اسلامی نظریے کے مطابق اور نہ غیر اسلامی نظریے کے مطابق۔ جو کچھ حکمران بنانا چاہیں گے قوم کا عدم تعاون اس کو نہ چلنے دے گا۔ جو کچھ قوم بنانا چاہے گی' حکمرانوں کی جبری اور بعض حالات میں مسلح مزاحمت اس کو نہ چلنے دے گی۔ اس کش مکش کو کسی کا جی چاہے تو جب تک چاہے

طول دیتا رہے۔ آخر کار پاکستان کی تعمیر کے لیے اگر کوئی کام ہو سکے تو اسی وقت ہو سکے گا جبکہ قوم اور اس کے حکمرانوں کا مقصد اور مسلک ایک ہو اور وہ اسلام اور صرف اسلام ہی ہو سکتا ہے۔

☆ اس تجزیے پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اگر اسلام نے مسلمانوں کا ایک نظام تمدن دیا ہے اور اس کی روایات ہماری قوم میں بڑی مضبوط ہیں تو پھر یہ کہنا کہاں تک درست ہو گا کہ پاکستان کے مختلف عناصر کی معاشرت اور ان کا مفاد ایک دوسرے سے مختلف، بلکہ متصادم ہے؟

○ اس کے جواب میں، میں کہوں گا کہ جہاں تک تمدن و معاشرت کے مختلف ہونے کا تعلق ہے، اس کی وجہ تو یہ آسانی سمجھ میں آ سکتی ہے اگر ہم اس ملک میں مسلمانوں کی تاریخ کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اس ملک میں اسلام کو پوری طرح کام کرنے کا کبھی موقع نہیں ملا کہ وہ یہاں کے مسلمانوں کو مکمل طور پر ایک تہذیب و تمدن میں رنگ دیتا۔ اسلام کے ساتھ ساتھ دوسری تمدنی قوتیں بھی یہاں کارفرما رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم برعظیم ہندو پاکستان کے مسلمانوں کی زندگی کا تجزیہ کرتے ہیں تو ہمیں صاف یہ نظر آتا ہے کہ ان کے اندر وحدت کے جتنے عناصر ہیں، وہ تو سارے اسلام نے فراہم کیے ہیں، مثلاً عقائد، اذان، نماز، روزہ، جمعہ اور عیدین، حج، ختنہ، نکاح و طلاق و وراثت کے قوانین، لباس میں ستر کے حدود، کھانے پینے میں حرام و حلال کے قیود، معاشرت میں پردہ وغیرہ۔ اس کے برعکس ان کی زندگی میں اختلاف اور بیچ رنگی کے جتنے عناصر ہیں، وہ سارے کے سارے دوسری تمدنی قوتوں کے فراہم کردہ ہیں۔ اب اگر یہاں اسلام کو کام کرنے کا پورا موقع ملے اور نظام تعلیم و تربیت میں، قوانین میں، حکومت کی پالیسی میں اور دوسرے معاملات میں وہ پوری طرح یہاں کارفرما ہو تو وحدت پیدا کرنے والی طاقت زور پکڑتی جائے گی اور اختلاف پیدا کرنے والی طاقتیں کمزور ہوتی جائیں گی۔ لیکن اگر اس کے برعکس وحدت کا یہ واحد رشتہ تعلیم و تمدن اور قانون اور دوسرے موثر ادارات سے بے دخل رہے تو لامحالہ اختلاف پیدا کرنے والی طاقتیں زور پکڑتی جائیں گی اور ہماری آبادی کے مختلف عناصر کو بکھیر کر رکھ دیں گی۔

رہا معاشی مفاد کا مسئلہ تو وہ قدرتی اسباب سے مختلف علاقوں میں رہنے والے لوگوں کے درمیان تصادم پیدا کرتا ہے۔ اگر اسلام کی رہنمائی میں ہم اپنے معاشی مسائل کو منصفانہ طریقے پر حل کر لیں اور اس کے ساتھ مسلمانوں کے اندر اعتقادی اور اخلاقی وحدت کو بھی بڑھائیں تو یہ تصادم روز بروز خفیف ہوتا جائے گا اور کبھی نازک صورت اختیار نہ کرنے پائے گا۔ لیکن بہ صورت دیگر اس کو کوئی طاقت روز بروز بڑھنے اور پاکستان کے مختلف حصوں کو باہم دست و گریبان کر دینے سے نہ روک سکے گی۔

☆ اس سلسلے میں ضمناً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اسلامی نظریے کی یہی اہمیت ہے تو آخر دوسرے مسلم ممالک اس کو چھوڑ کر دوسرے نظریات کیوں اختیار کر رہے ہیں؟

○ اس کا جواب یہ ہے کہ تمام مسلمانوں پر وہی ایک بلامسلط ہے جو ہمارے اس ملک پر مسلط رہی ہے' یعنی کارفرمائی کی طاقتیں ہر جگہ ان لوگوں کے ہاتھوں میں ہیں جنھوں نے نہ کوئی اسلامی تعلیم و تربیت پائی ہے اور نہ اسلامی ذہنیت ان میں موجود ہے۔ قوم ہر جگہ مسلمان ہے' اسلامی جذبات رکھتی ہے اور اسلامی روایات اس میں گہری جڑوں کے ساتھ جمی ہوئی ہیں۔ لیکن سیاسی اور معاشی طاقت ہر جگہ ایک ایسی مختصر سی اقلیت کے ہاتھ میں ہے جس نے یا تو براہ راست مغربی استعمار کی گود میں پرورش پائی ہے یا مغربی استعمار سے چوٹ کھا کر اس کے آگے پوری طرح سپر ڈال دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر جگہ قوم اور ان استعمار زادوں کے درمیان کش مکش برپا ہے اور ہر جگہ مغربی نظام زندگی کا اجنبی پودا بالکل ایک دوسری سرزمین اور مخالف آب و ہوا میں لا کر زبردستی لگایا اور پروان چڑھایا جا رہا ہے---

☆ آپ کے نزدیک اسلامی نظریے کو عملاً بروئے کار لانے کے لیے کون سے اقدامات ضروری ہیں۔ سیاسی اور تہذیبی زندگی پر اس نظریے کے کیا اثرات مرتب ہونے چاہییں؟

○ سب سے پہلے جس چیز کی ضرورت ہے وہ تو اس ملک میں جمہوریت کی بحالی ہے۔ اس لیے کہ اگر اس ملک کی حیثیت اس گھوڑے کی سی ہو جس کے منہ میں لگام ڈال کر ہر طاقت ور شخص اس پر زبردستی سوار ہو جائے اور اسے اپنے راستے پر چلانا شروع کر دے' تو ایسی حالت میں گھوڑے غریب کے لیے یہ سوچنا ہی لاحاصل ہے کہ وہ کدھر جانا چاہتا ہے اور اپنی مرضی کے راستے پر جانے کے لیے اسے کیا کرنا چاہیے۔ ہمیں سب سے پہلے اس حالت کو بدلنا چاہیے۔ ہم کو یہاں ایک آزادانہ جمہوری ماحول درکار ہے جس میں اظہار خیال' اجتماع' تنظیم اور سعی و جہد کی آزادی ہو' جس میں ہر شخص اپنے خیالات کے مطابق رائے عام کو ہموار کرنے کی کوشش کر سکے' جس میں رائے عام کا کسی نظریے کے حق میں ہموار ہو جانا ہی اس نظریے کے مطابق قیادت میں تبدیلی ہو جانے کے لیے کافی ہو' اور جس میں قیادت کی تبدیلی کے لیے ایک پرامن آئینی راستہ موجود ہو۔ ایسے ماحول میں تو یہ ممکن ہے کہ میں اپنے نظریے کو بروئے کار لانے کے لیے کچھ اقدامات سوچ سکوں' انھیں بیان کر سکوں' لوگ ان کے صحیح یا غلط ہونے کے متعلق کوئی رائے قائم کر سکیں' اور جن کے نزدیک وہ صحیح ہوں وہ میرے ساتھ مل کر عملاً ان اقدامات کے لیے کوشش کر سکیں۔ لیکن اگر یہ ماحول موجود نہ ہو تو میرا اور آپ کا کسی قسم کے اقدامات کو سوچنا بے کار ہے۔ پھر تو سوچنا صرف ان لوگوں کا کام ہے جو گھوڑے پر سوار ہونے کی طاقت رکھتے ہوں۔

یہ لازمی اور ابتدائی شرط پوری ہونے کے بعد جو اقدامات اس نظریے کو بروئے کار لانے کے لیے درکار ہیں' وہ تین بڑے بڑے شعبوں پر مشتمل ہونے چاہییں' یا دوسرے الفاظ میں اس مقصد کے لیے بہ یک وقت تین سمتوں میں متوازن طریقے سے کوشش کی جانی چاہیے۔

ایک، تبلیغ و تعلیم اور تعمیر فکر۔ اس سے میری مراد یہ ہے کہ ہم اپنے ملک کی آبادی کو وسیع اور عمیق پیمانے پر اسلام کے عقائد، اصول، احکام اور اخلاقی و عملی تقاضوں سے آگاہ کریں۔ غیر اسلامی نظریات و افکار اور نظام زندگی کے جو اثرات ان کے ذہن میں تھوڑے یا بہت اتر گئے ہیں، ان کو صاف کریں۔ مختلف ذہنی طبقات کو ان کی استعداد کے مطابق یہ سمجھائیں کہ اسلام کے مطابق ہماری زندگی کے مختلف شعبوں کی تشکیل کس طرح ہونی چاہیے اور مختلف مسائل حیات کو کیسے حل کرنا چاہیے۔

دوسرے، اصلاح اخلاق یعنی لوگوں کی عملی زندگی کو اسلام کے تقاضوں کے مطابق درست کرنا اور ان غیر اسلامی اثرات کو عملاً ان کی زندگی سے خارج کرنا جو جہالت و جاہلیت کی وجہ سے یا قدیم غیر اسلامی تقلید کے باعث یا مغربی تہذیب و تمدن کی بدولت ان کے اندر پھیلے ہوئے ہیں۔

تیسرے، نظام حکومت کی اصلاح، تاکہ حکومت کے ذرائع و وسائل اور اس کے قوانین اور اس کے انتظامی اختیارات اسلام کے مطابق ہماری زندگی کی تعمیر نو میں استعمال ہو سکیں اور بالآخر ہم دنیا میں اس مشن کو پورا کرنے کے قابل ہو جائیں جو ایک امت مسلمہ ہونے کی حیثیت سے خدا نے ہمارے سپرد کیا ہے۔

ان تینوں شعبوں میں جس نوعیت کا کام درکار ہے، اس پر غور کرنے سے خود بخود آپ ایک چوتھی چیز کی ضرورت بھی محسوس کرلیں گے جس کے بغیر یہ کام نہیں ہو سکتا، اور وہ یہ ہے کہ ایک گروہ ہمارے اندر ایسا ہو جو اس کام کو انجام دینے کے لیے مخلص، صحیح الفکر اور صالح العمل کارکنوں پر مشتمل ہو۔ وہ منظم طریقے سے اس مقصد کے لیے سعی و جہد کرے، وہ خود اپنے کارکنوں کی اصلاح و تربیت کی طرف بھی متوجہ رہے اور کام کی وسعت کے ساتھ ساتھ مزید کارکن بھی پیدا کرتا رہے۔

سوال کا آخری حصہ بڑی تفصیلی بحث چاہتا ہے جس کا یہاں موقع نہیں ہے۔ مختصر طور پر بس یہ سمجھ لیجیے کہ ہماری پوری قومی زندگی پر اس نظریے کے یہ اثرات مرتب ہونے چاہییں کہ ہم من حیث القوم دنیا میں دین حق کے سچے نمایندے بن کر کھڑے ہو سکیں۔ آج تو یہ ہمارا محض دعویٰ ہی ہے کہ ہم ایک مسلمان قوم ہیں، ورنہ عملاً ہم اپنی زندگی کے ہر شعبے میں وہی سب کچھ کر رہے ہیں جو کوئی غیر مسلم قوم کرتی ہے، بلکہ ہماری کوشش یہ ہے کہ یورپ اور امریکہ کے لوگ ہمیں بالکل اپنے ہی جیسا پائیں اور ہم کو اپنی نقل مطابق اصل دیکھ کر داد دیں۔ لیکن اسلامی نظام زندگی کو شعوری طور پر اختیار کرنے کا نتیجہ لازماً یہ ہونا چاہیے کہ ہمارے اخلاق اور معاشرت میں، تہذیب و تمدن میں، ادب اور فنون میں، معیشت اور مالی معاملات میں، قانون اور عدالت میں، سیاست اور بین الاقوامی رویے میں، غرض ہماری ہر چیز میں اسلام کا اثر اتنا نمایاں ہو کہ کتابوں کو پڑھنے کے بجائے صرف ہمیں دیکھ کر ہی دنیا یہ جان لے کہ اسلام کیا ہے اور وہ انسان کو کیا کچھ بنانا چاہتا ہے۔ (چراغ راہ، نظریہ پاکستان نمبر، دسمبر ۱۹۶۰ء)

فہم حدیث

وقت کی منصوبہ بندی

مولانا عبدالمالک

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان فرماتے ہیں:
ابراہیم علیہ السلام کے صحیفوں میں یہ بات بھی ہے کہ عقل مند آدمی کے لیے' جبکہ اس کی عقل کام کرے' لازم ہے کہ وہ اپنے اوقات اس طرح تقسیم کرے کہ اس میں کچھ گھڑیاں ایسی ہوں کہ ان میں اپنے رب سے مناجات کرے' کچھ گھڑیاں ایسی ہوں کہ ان میں اپنے نفس کا محاسبہ کرے' ایک گھڑی ایسی بھی ہو کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی شان صناعی میں غوروفکر کرے' اور ایک گھڑی ایسی بھی کہ اس میں اپنی ضروریات خوردونوش کے لیے فارغ ہو۔

اور عقل مند آدمی کا کام ہے کہ رخت سفر نہ باندھے مگر تین چیزوں کے لیے: آخرت کے توشے کے لیے' معاش کے سلسلے میں کاروبار کے لیے یا ایسی لذت کے حصول کی خاطر جو حرام نہ ہو۔

اور عقل مند آدمی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے زمانے کو دیکھنے' سمجھنے والا ہو' اپنی حالت پر توجہ دینے والا ہو اور اپنی زبان کی حفاظت کرنے والا ہو۔ جو آدمی اپنے کلام کو اپنا عمل سمجھتا ہو' اس کا کلام تھوڑا ہو گا مگر یہ کہ بامقصد باتیں ہوں' وہ ان ہی تک اپنے آپ کو محدود رکھے گا (صحیح ابن حبان)۔

اپنی تربیت اور تزکیے کے لیے اور زندگی میں کچھ کرنے کے لیے اپنے وقت کا صحیح استعمال ضروری ہے۔ شاید وقت کی برکت کا راز یہی ہے کہ اسے منصوبہ بندی کے تحت گزارا جائے۔ وقت کی تنظیم آج کے دور کا اہم موضوع ہے۔ ادارے اپنے عملے کو اس کی تربیت دینے اور اس کی اہمیت کا احساس دلانے کے لیے باقاعدہ کورس کرواتے ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے انسان کی دانش مندی کا تقاضا قرار دیا۔

آپؐ نے اوقات کی منصوبہ بندی کے لیے بنیادی ہدایات دیں اور فرد کو اپنی شخصیت کی تعمیر کے لیے جن بنیادی امور کی ضرورت ہے' ان کی طرف اشارہ کر دیا۔ آیات الٰہی میں غوروفکر' محاسبہ نفس اور دعا--- یہ تینوں امور اگر شعوری طور پر ہوں' وقت مختص کر کے ان کا التزام کیا جائے تو لازماً زندگی بہتر ہو گی' ہر آنے والا دن گزرے دن سے بہتر ہو گا۔

ساتھ ہی دنیاوی ضروریات کے لیے وقت خرچ کرنے کو بھی منصوبہ بندی کا حصہ بنا کر اس کی دینی حیثیت واضح

کر دی۔ یقیناً آخرت کی کامیابی کا راستہ دنیا کے روز مرہ مشاغل سے گزر کر ہی جاتا ہے۔

وقت کی تنظیم انسان کے لیے اتنی اہمیت رکھتی ہے کہ سابقہ صحیفوں میں بھی اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حوالے سے اپنی بات بیان کی۔

حرکت میں برکت ہے اور سفر وسیلہ ظفر ہے، مقبول عام ضرب الامثال ہیں۔ اس حدیث میں آپؐ نے سفر کے مقاصد متعین کر دیے ہیں۔ انسان کو چاہیے کہ وہ ہر سفر سے پہلے جائزہ لے کہ وہ ان تین مقاصد میں سے کس دائرے میں آتا ہے۔ مقاصد میں بہت وسعت ہے۔ سیر و سیاحت کے لیے بھی اجازت ہے اگر کسی حرام لذت کا حصول پیش نظر نہ ہو۔ سفر کی دعا بھی اسی لیے ہے کہ انسان ناجائز مقاصد کے لیے سفر سے باز رہے۔ جائز مقاصد کے لیے، آخرت حاصل کرنے کے لیے، معاش حاصل کرنے کے لیے اور لطف و تفریح کے لیے سفر کرنے سے خواہ مخواہ احتراز بھی نہ کریں۔

دین دار فرد کے لیے یہ مشہور ہو گیا ہے کہ اس کا زمانے سے تعلق نہ ہو، وہ سب سے کٹ کر اپنی دنیا آباد کرے اور اس میں مست رہے، اس حد تک کہ اسے اپنا بھی ہوش نہ رہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بتاتے ہیں کہ عقل مند آدمی کے لیے ضروری ہے کہ وہ زمانے کو دیکھے، سمجھے، اس کے تقاضوں کے مطابق دین پر عمل کرے اور اپنی ذات کا بھی خیال رکھے۔

اپنی باتوں کو بھی اپنا عمل سمجھنا بڑی اہم اور بنیادی تعلیم ہے۔ عموماً ہم گفتگو کو اعمال شمار نہیں کرتے۔ بے تکان اور خواہ مخواہ بھی بولتے ہیں۔ اگر اس کے حساب کتاب کا بھی تصور ہو تو لازماً کلام مختصر ہو گا، بامعنی ہو گا اور لایعنی باتوں سے پرہیز بھی ہو گا۔

○

عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا: میں تمھیں پتا نہ دوں ایسے شخص کا جو اللہ کو سب سے زیادہ محبوب ہو گا اور قیامت کے روز اس کی نشست تم سب کے مقابلے میں مجھ سے زیادہ قریب ہو گی۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا، کیوں نہیں؟ یا رسول اللہ! ضرور بتلایئے۔ آپؐ نے فرمایا: تم میں سے سب سے زیادہ اچھے اخلاق والا"۔ (صحیح ابن حبان)

ایک مشاہدہ یہ ہے کہ بعض افراد عبادات کا بڑا اہتمام کرتے نظر آتے ہیں۔ اذکار و نوافل میں مشغول رہتے ہیں۔ دین کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر عمل میں شدت کا مظاہرہ کرتے ہیں لیکن مزاج کے کرخت اور ترش ہو جاتے ہیں۔ جو اللہ سے جتنا قریب ہو، اس کے اخلاق اتنے ہی اچھے ہونے چاہییں۔ وہ اللہ کی مخلوق کا خیال رکھنے والا، ان کو تکلیف نہ پہنچانے والا، ان کے حقوق ادا کرنے والا، ان سے نرم بات کرنے والا، ان کا اکرام کرنے والا، ان کو حقیر نہ سمجھنے والا ہونا چاہیے۔ اس کا اظہار اس کی زندگی کے رویوں سے ہونا چاہیے۔ عبادات تو قرب الٰہی کا ذریعہ اور اس کی علامت ہیں۔ ان سے اخلاق میں بھی حسن آنا چاہیے۔ قرب الٰہی کے حصول کا ذریعہ، اچھے اخلاق بھی

ہیں، اچھے اخلاق دنیا ہی نہیں، آخرت بھی بناتے ہیں۔

○

ربعی بن حراشؒ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جناب میں آیا اور عرض کیا یارسولؐ اللہ مجھے ایسے عمل کا پتا دیجیے جس کی بنا پر مجھے اللہ محبوب بنالے، اور لوگ بھی محبت کریں۔ آپؐ نے فرمایا: وہ عمل جس کی وجہ سے اللہ تجھ سے محبت کرے، وہ دنیا سے بے رغبتی ہے اور وہ عمل جس کی وجہ سے لوگ تجھ سے محبت کریں، وہ یہ ہے کہ تو دنیا کے اس گھٹیا سازوسامان کو ان کی طرف پھینک دے۔ **(مسند ابراہیم بن ادھم بحوالہ جوامع العلوم والحکیم، ص ۲۵۳)**

انسان کو دنیا برتنے کے لیے ہی دی گئی ہے۔ یہی اس کی آزمایش ہے۔ اسی پر اس کی کامیابی یا ناکامی کا مدار ہے۔ دنیا کے بارے میں غلط رویے زندگی کو جہنم بنا دیتے ہیں اور مسائل کا باعث بنتے ہیں۔ اس کے پیچھے لپکنے والے، اس کو سب کچھ سمجھنے والے، نہ اللہ کو خوش کر پاتے ہیں نہ بندوں کو۔ دنیا کو دنیا کی جگہ پر رکھو، اس کی محبت سے بچو تو اللہ تمھیں محبوب بنالے گا۔ اور دنیا کو دوسروں کے لیے چھوڑ دو، لوگ بھی محبوب بنالیں گے۔ آسان نسخہ ہے۔ حقیقت کو جان کر اسے تسلیم کرنا اور اس کے مطابق عمل کرنا آسان ہی ہونا چاہیے۔ الا یہ کہ انسان خود اپنے آپ کو دھوکہ دینا پسند کرے۔

عبدالجبار بن وھب سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ سعید بن طارقؓ نے اپنے باپ سے روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "دنیا اچھی ہے اس کے لیے جو اس سے اپنی آخرت کے لیے توشہ بنائے حتیٰ کہ اس کا رب اس سے راضی ہو جائے۔ اور دنیا بری ہے اس کے لیے جس کو وہ اس کی آخرت سے روک دے۔ جب بندہ کہتا ہے کہ اللہ دنیا کا برا کرے تو وہ جواب میں کہتی ہے: اللہ ہم میں سے اس کا برا کرے جو ہم میں سے اللہ کا زیادہ نافرمان ہے۔ **(حاکم فی المستدرک)**

ضحاک بن مزاحم سے روایت ہے کہ ایک آدمی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کیا: تمام لوگوں سے بڑھ کر زاہد کون ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا: جو قبر کو نہ بھولے اور دنیا کی زینت کو چھوڑ دے اور باقی رہنے والی چیز کو فانی پر ترجیح دے اور کل کے دن کو اپنی زندگی کے دنوں میں شمار نہ کرے اور اپنے آپ کو مردوں میں شمار کرے۔ **(ابن ابی الدنیا)**

○

ابو سعید خدریؓ کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسلام میں کوئی ایسا حکم نہیں جس میں ضرر ہو۔ اور کسی دوسرے کو نقصان دینے کی اجازت نہیں ہے۔ **(ابن ماجہ، دارقطنی)**

دین کا کیسا انقلابی تصور ہے!

کوئی ایسی تعلیم نہیں' کوئی ایسا حکم نہیں جس میں انسان کے لیے ضرر اور نقصان ہو۔ ہر حکم میں انسان کی بہتری' بھلائی' فلاح اور اس کا آرام پیش نظر ہے۔ انسانی عذرات کا مکمل لحاظ رکھا گیا ہے (بیمار کو روزے سے رخصت ہے' نماز بیٹھ کر' لیٹ کر ادا ہو جاتی ہے' راستے سے پتھر ہٹا دینا بھی صدقہ ہے)۔

○

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں تمھیں دنیا و آخرت والوں کے سب سے اونچے اور کریمانہ اخلاق نہ بتلا دوں۔ پھر جواب میں خود ہی ارشاد فرمایا: تو تعلق رکھے اس سے جو تجھ سے قطع تعلق کرے اور اسے عطا کرے جو تجھے محروم رکھے اور اسے معاف کر دے جو تجھ پر ظلم کرے۔ (طبرانی) حضرت معاذ بن جبلؓ کی روایت میں جو مسند احمد میں ہے اس میں "جو تجھ پر ظلم کرے" کی جگہ "جو تجھے گالی دے" کے الفاظ آئے ہیں۔

ایک آدمی اپنے آپ سے بہتر کس کو جان سکتا ہے۔ ہم خود معلوم کر سکتے ہیں کہ پیمانہ اخلاق پر ہم کس درجے میں ہیں۔ ہم سے کوئی قطع تعلق کر لے' کوئی ہمیں محروم کر دے' کوئی ہم پر ظلم کرے' گالی دے تو ہمارا ردعمل اور رویہ کیا ہوتا ہے؟

○

حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں ایک قوم کی طرف بھیجا تو انھوں نے عرض کیا یارسول اللہ مجھے کوئی وصیت فرمایئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "سلام کو پھیلاؤ' کھانا کھلاؤ اور اللہ سے اس طرح شرم کرو جس طرح اپنے گھرانے کے معزز اور باوقار شخص سے شرماتے ہو' جب کوئی برائی کر گزرو تو پھر نیکی کرو اور اپنے اخلاق کو جس قدر اچھا کرنے کی استطاعت ہو اس قدر اچھا کرو" (مسند بزاز)۔

اگر خدا سے اتنی بھی حیا ہو جتنی خاندان کے کسی بزرگ سے عموماً کی جاتی ہے (کتنے ہی نوجوان آج بھی بزرگوں کے سامنے سگریٹ نوشی نہیں کرتے) تو انسان کے لیے گناہ کرنا نہایت مشکل ہو جائے۔ بزرگوں کے سامنے تہذیب کے دائرے سے باہر حرکتوں سے پرہیز کرتے ہیں۔ گناہ بھی دراصل اللہ کی بے ادبی ہیں۔ جن باتوں سے وہ ناراض ہوتا ہے--- اور ہم یہ جانتے ہیں--- پھر بھی ہم وہ کام کرتے ہیں تو دراصل حیا کا تقاضا پس پشت ڈالتے ہیں۔ نفس کی کمزوریوں پر قابو پانے کے لیے یہ احساس کہ اللہ تعالیٰ ہمیں دیکھ رہا ہے' نہایت موثر ہے۔ پھر انسان حیا کرے گا' گناہ سے بچے گا۔

حضرت معاذؓ کو یہ وصیت کسی نئی جگہ جاتے ہوئے کی۔ سلام پھیلانے اور کھانا کھلانے کی تلقین کی۔ یہ دونوں عمل اخوت کا جذبہ بیدار کرتے ہیں اور الفت و محبت پیدا کرنے کے لیے مجرب اور اکسیر ہیں۔ اس کے ساتھ اگر اخلاق بھی اچھے اور کریمانہ ہوں تو عمل کرنے والا محبوب خلائق بن جاتا ہے۔ کسی کے ساتھ برائی ہو جاتی ہے تو ارادہ کر کے اس کے ساتھ نیکی کرتا ہے۔ اور اللہ سے حیا بھی کرتا ہے تو زندگی خوب ہی حسین ہو جاتی ہے۔ دعوت اسلامی کا کام کرنے والوں کے لیے' نئی جگہ جا کر آباد ہونے والوں کو اس وصیت پر عمل کرنا چاہیے۔

مجاہد

وہ شخص ہے ' جو
ہر وقت اپنے مقصد کی دھن میں لگا ہو '
دماغ سے اس کے لیے تدبیریں سوچے '
زبان و قلم سے اس کی تبلیغ کرے '
ہاتھ پاؤں سے اس کے لیے دوڑ دھوپ ' محنت کرے '
اپنے تمام امکانی وسائل اس کو فروغ دینے میں صرف کر دے ' اور
ہر اس مزاحمت کا پوری قوت سے مقابلہ کرے جو
اس راہ میں پیش آئے ' حتیٰ کہ
جب جان کی بازی لگانے کی ضرورت ہو تو
اس میں بھی دریغ نہ کرے۔

(تفہیم القرآن ج ا' ص ۴۶۷)

(بندہ خدا)

"صبر کرنے والے"

سے مراد وہ شخص ہے جو اپنے نفس کو قابو میں رکھے اور اچھے اور برے تمام حالات میں بندگی کے رویے پر ثابت قدم رہے۔ جس کا حال یہ نہ ہو کہ اچھا وقت آئے تو اپنی ہستی کو بھول کر خدا سے باغی' اور بندوں کے حق میں ظالم بن جائے' اور برا وقت آجائے تو دل چھوڑ بیٹھے اور ہر ذلیل سے ذلیل حرکت کرنے پر اتر آئے۔

"شکر کرنے والے"

سے مراد وہ شخص ہے جسے تقدیر الٰہی خواہ کتنا ہی اونچا اٹھا لے جائے' وہ اسے اپنا کمال نہیں بلکہ اللہ کا احسان ہی سمجھتا رہے' اور وہ خواہ کتنا ہی نیچے گرا دیا جائے' اس کی نگاہ اپنی محرومیوں کے بجائے ان نعمتوں پر ہی مرکوز رہے جو برے سے برے حالات میں بھی آدمی کو حاصل رہتی ہیں' اور خوشحالی و بدحالی دونوں حالتوں میں اس کی زبان اور اس کے دل سے اپنے رب کا شکر ہی ادا ہوتا رہے۔

(تفہیم القرآن ج ۴' ص ۵۰۶)

(خیر خواہ)

ایں جلوہ گاہ کیست

ماہر القادری

لبیک اللھم لبیک' لبیک لا شریک لک لبیک - ان الحمد والنعمۃ لک والملک لا شریک لک!

لیجیے حدود حرم سے بھی کچھ آگے نکل آئے۔ تلبیہ پڑھتے میں' آنکھیں بھی زبان اشک سے لے میں لے ملا رہی ہیں۔ مکہ کے قریب کے میدان اور پہاڑیوں کو دیکھ کر بار بار یہ خیال آ رہا ہے کہ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم ادھر سے ضرور گزرے ہوں گے۔ کیا عجب ہے ان وادیوں میں سرکارؐ نے بکریاں بھی چرائی ہوں۔ نہ جانے اس سرزمین کے کون کون سے قطعے ہیں جو حضورؐ کی پابوسی کے شرف کو اپنی جبینوں اور سینوں میں محفوظ کیے ہوئے ہیں!

مکہ کی آبادی آ گئی۔ رات کا وقت ہے۔ ایسے میں جو ٹیلہ' جو پہاڑی اور جو مکان بھی نظر آتا ہے' عقیدت کہتی ہے کہ اسے دل میں اتار لیجیے۔ یہ لندن اور پیرس نہیں مکہ مکرمہ ہے۔ یہ بلد امین ہے۔ ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام دونوں باپ بیٹوں نے اسی مقدس سرزمین پر کعبہ کی بنیادیں اٹھائی تھیں اور اس پاک اور مبارک شہر کا سب سے بڑا شرف یہ ہے کہ یہ انسانیت کے محسن اعظم' دنیا کے سب سے بڑے آدمی اور نبیوں کے خاتم محمدؐ عربی (فداہ ابی وامی) کا مولد و منشا ہے۔ زمانہ کی قدر ناشناسی اور دنیا کی غفلت کے ہاتھوں انسانی مجد و شرف کی تاریخ یا تو لوگوں نے بھلا دی تھی یا پھر اسے مسخ کر دیا تھا۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ انسانیت کی تاریخ کا پہلا ورق اسی سرزمین پر مرتب ہوا۔ اسی شہر میں حق کی وہ آواز بلند ہوئی جس نے باطل کے جسم میں تھرتھری پیدا کر دی۔ یہ تاریخی شہر نہیں بلکہ خود "تاریخ ساز" شہر ہے۔ اس شہر پر تاریخ کا ذرہ برابر بھی احسان نہیں ہے بلکہ خود تاریخ پر اس شہر کا احسان ہے' تاریخ اس شہر سے جانی پہچانی جاتی ہے۔ اگر تاریخ سے "مکہ" کو نکال دیا جائے تو پھر تاریخ میں رہ کیا جائے گا!

مکہ مکرمہ کی آبادی میں دس بجے پہنچ گئے مگر معلمین کے مکانوں پر زائرین کے سامان اتارے جانے کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے تو رات کے تین بج گئے۔ سب کے بعد ہمارا نمبر آیا۔ جلد جلد وضو کر کے عشاء کی نماز معلم کے مکان پر پڑھی۔ عجلت اس بات کی تھی کہ حرم شریف میں جلد سے جلد حاضری ہو جائے!

مطوف آگے آگے ہے اور ہم حرم شریف کی طرف جا رہے ہیں۔

پائم بہ پیش از سر ایں کو نمی رود!
یاراں خبر دہید کہ ایں جلوہ گاہ کیست

میرا پاؤں اس کوچے کے سرے سے آگے نہیں جاتا۔ یاروں کو خبر دو کہ یہ کس کی جلوہ گاہ ہے۔

"باب السلام" سے داخلہ ہوا اور بیت اللہ پر نگاہ پڑتے ہی زبان پر تکبیر جاری ہو گئی!

اللہ اکبر اللہ اکبر لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر!

جلال و ہیبت اور جبروت کا سامنا ہے۔ ایک عالم گو مگو اور ایک کیفیت بے نام ہے جو طاری ہوتی چلی جا رہی ہے۔

محو کھڑا ہوا ہوں میں حسن کی بارگاہ میں
اب نہ کہیں نگاہ ہے' اب نہ کوئی نگاہ میں!

یااللہ! میں کہاں آ گیا! یہ میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں! مجھ سا پلید اور حرم مقدس میں! مجھ سا خطاکار' گناہ گار اور معاصی سرشت اس مقام پر جہاں ہر زمانے کے پاکبازوں اور نیکوکاروں نے سجدے اور طواف کیے ہیں۔ یہ پیروں سے نہیں' سر کے بل چلنے کا مقام ہے۔ یہاں کا جتنا بھی احترام کیا جائے' تھوڑا ہے۔ ہمہ شمہ کا کیا ذکر ہے۔ اللہ کے جس گھر کا خود حضور سید المرسلین' خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام نے طواف کیا ہو' جہاں حضور نے نمازیں پڑھی ہوں اور رو رو کر دعائیں مانگیں ہوں' وہاں مجھ جیسے نابکار کی حاضری ایک معجزے سے کم نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ جب فضل فرماتا ہے تو ایسے معجزے ظہور میں آتے رہتے ہیں!

کہاں بلایا گیا ہوں ـــــ العظمتہ للہ ع

کلاہ گوشہ دہقاں بہ آفتاب رسید

اور

اک اک قدم پہ سجدۂ شکرانہ چاہیے!

جب اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا ہے تو نصیب اسی طرح جاگا کرتے ہیں اور حقیر ذروں کو درخشانی اور ذلیل خار و خس کو رعنائی دی جاتی ہے۔ داتا جب دینے پر آئے تو اسے کون روک سکتا ہے۔ اس کے جود و عطا ہم دنیا والوں کے قانون اور ضابطے کے پابند نہیں ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس شہنشاہ حقیقی کے دربار سے کس کو کیا دیکھ کر نوازا جاتا ہے۔ جو انسان نفس اور روح کی ماہیت کو نہ سمجھ سکا اور خود اپنے جذبات اور محسوسات کا تجزیہ نہ کر سکا' وہ اللہ تعالیٰ کے اسرار کی پرچھائیں کو بھی بھلا پا سکتا ہے! بندے کا کام صرف سمع و اطاعت ہے۔ اسرار و غیوب کے حجابات' اٹھانے کی فکر میں لگے رہنا' بندے کا منصب ہی نہیں ہے!

اب ہم اس مقام (بیت اللہ) کا طواف کر رہے ہیں' جس کی طرف ساری عمر نمازیں پڑھی ہیں اور بچپن میں کعبہ کی طرف ہاتھ اٹھا کر قسمیں بھی کھائی ہیں۔ خوش قسمتی سے وقت ایسا ملا کہ شمع کے گرد پروانوں کا بہت زیادہ ہجوم نہیں ہے۔ اس لیے حجر اسود کے چومنے کا موقع بھی تھوڑی سی جدوجہد کے بعد مل گیا۔ حجر

اسود پر نگاہ پڑتے ہی حضرت عمر فاروقؓ کا وہ قول یاد آگیا کہ: "اے اسود! تو بس ایک پتھر ہے تو نہ کسی کو نقصان پہنچا سکتا ہے اور نہ نفع! میں تجھے اس لیے چومتا ہوں کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چومتے ہوئے دیکھا ہے"۔

اسلام کا یہی وہ مقام توحید ہے جہاں دوسرے مذاہب گرد منزل اور غبار راہ نظر آتے ہیں۔ توحید کے معاملے میں اسلام جذب و شوق کے کسی تقاضے کے لیے ذرا سی بھی رعایت دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔ غلط کہتے ہیں جو بھی کہتے ہیں کہ عشق شریعت کے حدود توڑ دیتا ہے۔ اس قسم کا عشق سنیاسیوں اور بیراگیوں کے یہاں مقبول ہو سکتا ہے مگر اسلام میں ٹھکرا دینے کے قابل ہے!

یہ رکن عراقی ہے' یہ رکن شامی اور رکن یمانی ہے' یہ حطیم ہے' یہ میزاب رحمت ہے' یہ مقام ابراہیم ہے' یہ باب کعبہ ہے' یہ ملتزم ہے---- یااللہ کیا کروں کیا نہ کروں۔ مجھ سے تو کسی ایک مقام تجلی کی تعظیم کا تھوڑا سا حق بھی ادا نہیں ہو رہا ہے۔ یہاں تو ہر بن مو کو سراپا محویت و استغراق ہو جانا چاہیے تھا۔ خدانخواستہ میں منافق تو نہیں ہو گیا؟ اے میرے پتھر دل! نرم ہو جا۔ پگھل اور اتنا پگھل کہ غلاف کعبہ پر تیرے خون کی سرخی نظر آنے لگے۔ ارے کم بخت اس سے زیادہ خشیت و تواضع اور توجہ الی اللہ کی گھڑی اور کب آئے گی! اے غفلت کوش اور غفلت شعار! یہاں بھی اگر بیدار نہ ہوا تو پھر تیرے لیے ابد تک موت ہے!

ایک عجیب عالم میں مطاف کے سات شوط (چکر) پورے کیے اور اس کے بعد حجر اسود کو چوما اور وہاں سے مقام ابراہیم پر آکر دو رکعت پڑھیں اور پھر ملتزم پر پہنچے۔

اے میرے دل' خدا کے لیے چونک! اور دل چونکنے لگا۔ اے میری آنکھو! اللہ کا واسطہ دیتا ہوں۔ آج آنسو بہانے میں کمی نہ کرنا اور آنکھوں میں بے اختیار آنسو آگئے۔ ملتزم پہنچ کر اللہ کا فضل ہے کہ آنکھوں نے دل کا بہت کچھ غبار دھو دیا۔ ان لمحوں کی کیفیت لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتی! دعا نہیں دعائیں کیں۔ دیر تک' بہت دیر تک---- ملتزم سے چمٹ کر' غلاف کعبہ کے سائے میں۔ توبہ' استغفار' عفو و رحمت کی طلب۔ آیندہ اچھی زندگی گزارنے کا عہد و پیمان۔ اپنے لیے اور ماں باپ کی مغفرت کے لیے۔ عزیزوں اور دوستوں کے لیے دعائیں۔ کیا عجب ہے کہ اللہ کی رحمت میرے بھکاریوں جیسے عجز و تذلل اور مجرموں جیسی ندامت و بدحواسی کو دیکھ کر مسکرا دی ہو!

ملتزم کے بعد حطیم میں پہنچ کر میزاب رحمت کے سائے میں دعا کی۔ پھر چاہ زمزم پر آئے اور خوب سیر ہو کر زمزم پیا اور سر پر بھی ڈالا۔ علم نافع اور رزق واسع کے لیے اللہ تعالیٰ کے حضور درخواست کی۔ یہاں سے چل کر مسعیٰ پہنچے۔ صفا اور مروہ کے درمیان لوگ بڑے ذوق و شوق کے ساتھ سعی کر رہے تھے۔ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ یہ وہی صفا ہے جس پر چڑھ کر حضورؐ نے قریش کے سامنے توحید کی دعوت

پیش کی تھی۔ اسی صفا اور مروہ کے درمیان حضرت ہاجرہ اپنے اکلوتے بچے اسماعیل (علیہ الصلوۃ والسلام) کے لیے پانی کی تلاش میں سات مرتبہ آئیں گئیں۔ ان کی یہ سعی اضطراب اللہ تعالیٰ کو پسند آگئی یہاں تک کہ وہ حج کے ارکان میں شامل کر لی گئی۔

بارگاہ اقدس میں

قصد ہے اور کہاں حاضری کا قصد ہے؟ وہاں کا جہاں کی تمنا اور آرزو نے بزم تصور کو سدا آباد رکھا ہے۔ خوشی کی کوئی انتہا نہیں۔ جسم کے روئیں روئیں سے مسرت کی خوشبو سی نکل رہی ہے۔ خوشی کے ساتھ ساتھ دل پر ایک دوسرا عالم بھی طاری ہے۔ یہ چہرہ جس پر گناہوں کی سیاہی پھری ہوئی ہے کیا حضور نبی کریم **علیہ الصلوۃ والتسلیم** کے مواجہ شریف میں لے جانے کے قابل ہے۔ اے آلودۂ گناہ! اے سر تاپاقدم معصیت! اے مجسم گندگی! اے غفلت شعار! ان کے حضور جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بعد پاکی، تقدیس، عصمت اور عظمت بس انھی کو سزاوار ہے۔ کس منہ سے روضہ اقدس کے سامنے "السلام علیکم یارسول اللہ" کہے گا۔ اس زبان نے کیسی کیسی فحش باتیں کی ہیں۔ ان لبوں کو کتنی بری بری باتوں کے لیے جنبش ہوئی ہے۔ ان آنکھوں نے کیسی کیسی قانون شکنیاں کی ہیں۔ اے نافرمان غلام، اپنے آقا کے دربار میں جانے کی جرات کس برتے پر کر رہا ہے؟ ان کی اطاعت سے کس کس طرح سے گریز کیا جا رہا ہے۔ ان کے حکم کو کس کس عنوان سے توڑا ہے۔ ان کے اسوۂ حسنہ سے تیری زندگی کو کوئی دور کی بھی نسبت نہیں رہی ہے!

اے روسیاہ! تیرے برے اعمال حضورؐ کی روح مقدس کو اذیت ہی پہنچاتے رہے ہیں۔ یہ تو پاکوں اور نیکوں کی سرزمین ہے۔ یہاں تجھ جیسے گندے آدمی کا کیا کام؟ مگر شرم و ندامت کے اس احساس کے ساتھ معاً یہ خیال بھی آیا کہ میرے آقا رحمتہ للعالمین اور شفیع المذنبین بھی تو ہیں۔ گناہ گاروں اور سیاہ کاروں کی جائے پناہ اور ہے کہاں؟ ان سے شفاعت نہ چاہیں تو اور کس سے چاہیں۔ قیامت کے دن لواء الحمد انھی کے ہاتھ میں ہو گا۔ تمام انبیا "نفسی نفسی" کہتے ہوں گے مگر "امتی امتی" صرف انھی کی زبان دہراتی ہو گی۔ ہزار نافرمان اور لاکھ گناہ گار سہی، مگر کہلاتے تو انھی کے ہیں۔ یہ کوئی معمولی نسبت ہے؟ ع

ذرۂ آفتاب تابانیم

نیکوں کی تو سبھی جگہ پوچھ ہوتی ہے۔ بروں کو تو انھی کے دامن رحمت میں پناہ ملتی ہے۔ ہم جیسے گناہ گاروں، سیاہ کاروں اور غفلت شعاروں کی بخشش ہی کے لیے حضورؐ راتوں کو رو رو کر دعائیں مانگتے تھے۔ رافت اور رحمت کے جذبے کی کوئی انتہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو رؤف و رحیم کے خطاب سے سرفراز کیا۔ جن کی ذات جمادات، نباتات اور چرند و پرند کے لیے رحمت ہے، کیا اپنے غلاموں اور امتیوں کے لیے رحمت نہ ہو گی؟ بے شک ہو گی اور سب کے مقابلے میں بڑھ کر ہو گی!

ماں باپ اپنی اولاد پر اتنی شفقت نہیں کر سکتے جتنی شفقت حضور رحمتہ للعالمین کی اپنے امتیوں پر رہی ہے۔ کیسے ہی نافرمان اور بدتوفیق سہی مگر نام لیوا تو انھی کے ہیں۔ کلمہ تو انھی کا پڑھتے ہیں۔ درود تو آپؐ ہی

پر بھیجتے ہیں۔ ہم لاکھ کمینے، اوچھے، کم ظرف اور نالائق سہی، لیکن جن کے ہم غلام ہیں، وہ تو سب کچھ ہیں۔ خدا کے بعد عظمت و برتری کا کون سا عنوان ہے جو حضورؐ کی ذات و صفات میں شامل نہیں ہے۔ جس نے خون کے پیاسے دشمنوں کو معافی دے دی، اس کی وسعت ظرف، مروت، عفو و کرم اور درگزر کی بھلا کوئی حد و نہایت ہے۔ مدینے کی طرف اپنے کو متقی نیکوکار اور پرہیزگار سمجھ کر ہم کب چلے تھے! اپنی پارسائی کا دعویٰ کسے ہے! یہاں تو بھاگے ہوئے غلاموں کی طرح حاضر ہوئے ہیں۔ ایک ایک آنسو کی بوند میں پشیمانی اور ندامت کے طوفان بند ہیں!

اسی عالم خیال و تصور میں "باب السلام" سے داخل ہوئے اور مسجد نبویؐ میں جا پہنچے۔ یہ سرو قامت ستون، یہ مصفا جھاڑ فانوس، یہ نظر افروز نقش و نگار، ایک ایک چیز آنکھوں میں کھبی جا رہی ہے۔ اور اس ظاہری چمک دمک سے بڑھ کر جمال و رحمت کی فراوانی جیسے مسجد نبویؐ کے در و دیوار سے رحمت کی خنک شعاعیں نکل رہی ہیں!۔

دامان نگہ تنگ، گل حسن تو بسیار
گل چیں بہار تو زداماں گلہ دارد

تیرے حسن کے پھول اتنے زیادہ ہیں کہ میری نگاہ کا دامن انھیں سمیٹ نہیں سکتا۔ تمھاری بہار کے پھول چننے والے کو گلہ دامن سے ہے۔

کی معنویت آج سمجھ میں آئی۔ تجلیوں کا وہ ہجوم کہ آنکھیں جلوے سمیٹتے سمیٹتے تھکی جا رہی ہیں۔ یہاں کے انوار کا کیا پوچھنا۔ یہ آفتاب جہاں تاب بیچارہ اس جلوہ گاہ کے ذروں کا ادنیٰ غلام ہے!

دائیں بائیں، اوپر نیچے، ادھر ادھر روشنی ہی روشنی اور نور ہی نور، مگر لطف یہ کہ آنکھیں خیرہ نہیں ہوتیں۔ یہ آنکھوں کا نہیں، خود یہاں کی تجلیوں کا کمال ہے۔ صوفیہ کا قول ہے کہ "تجلی میں تکرار نہیں"۔ مگر اس مسئلے پر غور کرنے کی یہاں فرصت کسے ہے!

جب ہم مسجد نبوی میں حاضر ہوئے ہیں تو ظہر کی نماز تیار تھی۔ سنتوں کے بعد جماعت سے نماز ادا کی۔ کہاں؟ مسجد نبویؐ اور سجدہ گاہ مصطفویؐ میں! پیشانی کی اس سے بڑھ کر معراج اور کیا ہو گی؟

نماز کے بعد اب روضہ اقدس کی طرف چلے۔ حاضری کی بے انداز مسرت کے ساتھ اپنی تہی دامنی اور بے مائیگی کا احساس بھی ہے۔ یہی سبب ہے کہ درود کے لیے آواز بلند ہوتے ہوتے بھنچ بھی جاتی ہے۔ قدم کبھی تیز اٹھتے ہیں اور کبھی آہستہ ہو جاتے ہیں۔ مواجہ شریف حاضر ہونے سے پہلے قمیص کے گریبان کے بٹن ٹھیک کیے، ٹوپی سنبھالی اور پھر۔

وہ سامنے ہیں، نظام حواس برہم ہے
نہ آرزو میں سکت ہے نہ عشق میں دم ہے

زائرین بلند آواز سے درود و سلام عرض کر رہے ہیں اور کتنے تو جالی مبارک کے بالکل قریب جا پہنچے ہیں

مگر اس کمینہ غلام کے شوق بے پناہ کی یہ مجال کہاں؟ چند گز دور ہی ستون کے قریب کھڑا ہو گیا۔ ہاتھ باندھے ہوئے مگر نماز کی ہیئت سے مختلف! آہستہ آہستہ صلوٰۃ و سلام عرض کر رہا ہوں کہ حضورؐ کی محفل کے آداب کا یہی تقاضا ہے اور یہ آداب خود قرآن نے سکھائے ہیں۔

الصلوٰۃ والسلام علیک یارسول اللّٰہ
الصلوٰۃ والسلام علیک یاحبیب اللّٰہ
الصلوٰۃ والسلام علیک یاخیر خلق اللّٰہ
الصلوٰۃ والسلام علیک یا رحمۃ للعالمین

زبان سے یہ لفظ نکلے اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے!___ صلوٰۃ و سلام عرض کر رہا ہوں مگر آواز گلوگیر ہوتی جا رہی ہے اور الحمدللہ کہ آنکھیں برس رہی ہیں۔ ندامت' مسرت اور عقیدت کے ملے جلے آنسو! نگاہیں روضہ مبارک کی جالیوں کو چوم رہی ہیں اور دل آنکھوں کو مبارک باد دے رہا ہے۔ زبان حال سے! آنکھوں کی اس سے بڑی خوش قسمتی اور کیا ہو سکتی ہے!

صلوٰۃ و سلام کے بعد دعا کی باری آئی۔ رحمت للعالمین کی بارگاہ اقدس ہے اور سرکار استراحت فرما رہے ہیں۔ مگر عرض معروض' التجا اور دعا تو اللہ تعالیٰ سے ہی کی جائے گی۔ سمیع و بصیر تو اسی کی ذات ہے۔ مشکلوں کو تو وہی کھولتا ہے۔ فریاد رس اس کے سوا اور ہے کون؟ پورا قرآن اس پر گواہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کی ذات حلال مشکلات اور دست گیر ہے۔ مدد صرف اسی سے چاہنی چاہیے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اللہ تعالیٰ ہی سے دعا مانگتے تھے اور اس عاجزی کے ساتھ مانگتے تھے کہ کوئی اتنا عجز و نیاز اور الحاح و تضرع پیش نہیں کر سکتا!

حضور کے مواجہ شریف میں دعا مانگی اور کعبہ کی طرف منہ کر کے دعا مانگی۔ ملتزم پر جو گریہ و الحاح کی کیفیت پیدا ہوئی تھی اس سے کم کیفیت یہاں طاری نہیں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کے حضور ایک گناہ گار اپنا درد و غم پیش کر رہا تھا اور وہ بھی شفیع المذنبین کے مواجہ میں! مغفرت و رحمت کے دریچے کھل گئے ہوں تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے! دل اگر آنسو بن کر بہہ جاتا تو دل کی یہ سب سے بڑی سعادت ہوتی۔ پھر بھی آنکھوں نے دعا کے آخری لفظوں تک ساتھ دیا۔ ہندستان کے مسلمانوں کی بے کسی اور مظلومیت کا ذکر زبان پر آتے ہی آنسوؤں کی روانی اور تیز ہو گئی اور ایسا محسوس ہوا جیسے دل کے ٹکڑے اڑے جا رہے ہیں!

عالم اسلام میں جو جماعتیں اقامت دین کے لیے جدوجہد کر رہی ہیں ان کے لیے بھی دعا کی۔ اقامت دین کے داعی سید ابوالاعلیٰ مودودی کے لیے خاص طور سے دعا کی اور یہ بھی عرض کیا کہ تیرا یہ فرض شناس حقیر بندہ اور تیرے رسول کا فدائی امتی تیرے دین کی سربلندی کے لیے سب کچھ کر رہا ہے۔ اسے صبر و استقامت کی مزید توفیق عطا فرما اور اس کی زبان و قلم سے جو بھول چوک ہوئی ہے اسے معاف فرما دے۔

(انتخاب: کاروان حجاز' ۱۹۵۵)

سیرت پاکؐ:

کاروبار مملکت کے لیے راہ نما

شاہ معین الدین ہاشمی

پاکستان کے حصول کا مقصد نہ تو ایک جغرافیائی خطہ تھا اور نہ ہی لسانی و نسلی بنیادیں اس کے لیے قوت محرکہ تھیں، بلکہ اس کا حصول اسی مقصد کے لیے ہوا جس کے لیے عہد نبویؐ میں اسلامی ریاست قائم کی گئی تھی۔ چنانچہ پاکستان کے استحکام کے لیے کوئی طریقہ اس کے علاوہ نہیں کہ اسے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی بنیاد پر استوار کیا جائے۔ جس کلمہ طیبہ کو تصور پاکستان سے قیام پاکستان تک بنیاد سمجھا گیا، اس سے انحراف، عدم استحکام ہے اور اسی سے وابستگی استحکام پاکستان کی واحد صورت ہے۔ اس کے لیے بہترین رہنمائی سیرت طیبہؐ سے حاصل ہو سکتی ہے۔

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی

رسولؐ اللہ نے انتہائی نامساعد حالات میں ایک مملکت کی بنیاد رکھی اور پھر انتہائی قلیل عرصے میں اس مملکت کو معاشرتی، اقتصادی، اخلاقی اور دفاعی استحکام بھی عطا کیا۔ آئندہ صفحات میں ان مثالوں سے استحکام پاکستان کے لیے رہنمائی کی صورتیں متعین کی جائیں گی۔

صحت مند معاشرے کا قیام: کوئی ملک اس وقت تک ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہو سکتا جب تک وہاں ایک اچھے اور درست سمت چلنے والے یعنی صحت مند معاشرے کے قیام کو ممکن نہ بنایا جائے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ایسے معاشرے سے واسطہ پڑا تھا جہاں مادہ پرستی اپنے عروج پر تھی۔ معاشی ترقی کے حصول، سیاسی اقتدار اور ظاہری عز و جاہ کی خاطر لوگ کچھ بھی کرنے کو تیار رہتے تھے۔ عہد حاضر کے معاشرے میں بھی یہ جاہلی اقدار کسی حد تک اس معاشرے کی طرح رائج ہیں۔ رسول اکرمؐ کی سیرت کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے معاشرے کو درست سمت پر چلانے کے لیے خصوصی کوششیں کیں۔

اخلاقی تعلیم و تربیت: معاشرے میں نافذ کی جانے والی اصلاحات' خواہ ان کا تعلق سیاست و معیشت سے ہو یا وہ کسی اور پہلو سے متعلق ہوں' اس وقت تک نافذ نہیں کی جا سکتیں جب تک معاشرے سے اخلاقی برائیوں کا خاتمہ نہ کر دیا جائے۔ قانون کتنا ہی سخت کیوں نہ ہو اور قانون نافذ کرنے والے ادارے کتنے ہی مستعد کیوں نہ ہوں' لوگ اس وقت تک نہیں سدھرتے جب تک ان میں ایمانی جذبہ بیدار کر کے مادہ پرستی کے رجحان کو کمزور نہ کر دیا جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ایک ایسے معاشرے میں ہوئی جس کی حالت ہر اعتبار سے ابتر تھی۔ آپؐ نے مکی اور مدنی زندگی اور پھر مدنی زندگی میں اخلاقی صحت کی طرف خصوصی توجہ فرمائی۔ اس بات پر آپؐ کا زیادہ زور تھا کہ افراد کی ذہنی و اخلاقی تربیت ہو اور قانون و ریاست کی کم سے کم مداخلت کے ساتھ بھی وہ صحیح راستے پر چلیں۔(۱) آپؐ کی مساعی کا رخ یہ تھا کہ اولاً لوگوں میں ایمانی حمیت بیدار کی جائے اور مادہ پرستی کے رجحانات کی حوصلہ شکنی کی جائے۔ پھر باہمی ہمدردی' احسان و ایثار' شجاعت و بہادری' صبر و استقلال' حلم و بردباری' عفو و درگزر' سخاوت و فیاضی' حسن خلق اور صدق و حیا جیسی صفات پیدا کی جائیں۔ لوگوں کا رخ ایسی تعلیمات کی طرف موڑا جائے جس سے یہ صفات ان میں بدرجہ اتم پیدا ہو جائیں۔(۲)

مذہبی' لسانی اور علاقائی تعصبات و تفرقے ایسے عفریت ہیں جن کے سامنے حکومت عاجز آتی جا رہی ہے۔ رسولؐ اللہ نے قوم پرستی اور نسل پرستی کو مٹا کر آفاقیت کا درس دیا۔ آپؐ نے فرمایا: "ساری مخلوق اللہ کے کنبے کی طرح ہے"۔(۳) آپؐ نے عصبیت پر جان دینے' عصبیت کی طرف بلانے اور عصبیت پر جنگ کرنے والوں کے متعلق فرمایا کہ وہ ہم میں سے نہیں۔(۴) آپؐ نے مومن کی جان' مال اور عزت کی حرمت قائم فرمائی ہے۔(۵)

تعلیم و تربیت کی طرف حضور اکرمؐ کی توجہ کا یہ عالم تھا کہ آپؐ نے حکومت کی تمام مشینری کا تعلق دیگر امور کے علاوہ براہ راست تعلیم و تبلیغ اور تزکیہ و تربیت پر توجہ دینے کے لیے جوڑ رکھا تھا۔ اسلامی ریاست کے مقرر کردہ تمام گورنر' عمال' سفیر' مفتیان و آئمہ سب کے سب عوام کی تعلیم و تربیت کے برابر ذمہ دار تھے اور اس کی طرف خصوصی توجہ دیتے تھے۔(۶)

۱۔ حکومت کو چاہیے کہ عوام کی اخلاقی تعلیم و تربیت کی طرف خصوصی توجہ دے۔ اس سلسلے میں پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا سے بہت کام لیا جا سکتا ہے۔

۲۔ ٹیلی وژن' ریڈیو اور اخبارات سے ایسے پروگراموں کو ختم کیا جائے جن سے قوم کے اخلاق پر منفی اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ الیکٹرانک میڈیا پر ایسے پروگرام ترتیب دیے جائیں جن سے اسلامی اخلاق لوگوں میں پروان چڑھیں اور ان کے دل و دماغ میں یہ بات راسخ ہو جائے کہ جملہ سعادتوں اور ترقیوں کی ضمانت اللہ اور

رسول اللہ کی پیروی میں مضمر ہے۔ اخبارات اور رسائل و جرائد کو بھی اس سوچ کو عام کر کے صحافتی ذمہ داریوں اور تقاضوں کو پورا کرنا چاہیے۔

حقوق و فرائض کا صحیح تعین: جس قوم کو بنیادی حقوق حاصل نہ ہوں اور ان کے فرائض کا صحیح تعین نہ کیا گیا ہو' وہ قوم کسی میدان میں مستحکم نہیں ہو سکتی۔ بنیادی ضروریات زندگی' جان' مال اور عزت و آبرو کی حفاظت اور دیگر سیاسی و سماجی حقوق فراہم کرنا حکومت کی اولین ذمہ داری ہے۔ عہد نبویؐ کی اسلامی ریاست میں اس قسم کے تمام حقوق مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلموں کو بھی حاصل تھے۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ایک وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی حکومت میں بہت کم احتجاجی تحریکیں اٹھیں۔ معاشرے کے اکثر افراد کو حقوق بلاامتیاز مہیا کیے گئے تھے۔ چنانچہ معاشرے میں امن و سکون کا دور دورہ تھا۔(۷)

بعض حقوق و فرائض ایسے ہوتے ہیں جو قومی یا علاقائی نوعیت اختیار کر لیتے ہیں۔ اگر ان کی طرف صحیح توجہ نہ دی جائے تو بھی ملک میں داخلی عدم استحکام کی صورت پیدا ہو جاتی ہے اور ملکی ترقی کی راہیں مسدود ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اس ضمن میں رسول اکرمؐ نے ابتدا ہی سے خصوصی توجہ فرمائی۔ چنانچہ اسلامی ریاست کی بنیاد رکھتے ہی مختلف قبائل کے درمیان حقوق و فرائض کا صحیح تعین فرمایا۔(۸)

۱۔ حکومت کو چاہیے کہ حقوق کی فراہمی میں امتیازی سلوک کا خاتمہ کرے تاکہ معاشرے کے کمزور افراد محروم نہ رہیں اور کسی طبقے کا استحصال نہ ہونے پائے۔ اجرتوں کا صحیح تعین کیا جائے تاکہ مزدور اور عام طبقہ متاثر نہ ہو کیونکہ اس طرح کی صورت حال میں طبقاتی کش مکش پروان چڑھتی ہے اور لوگ اپنی صلاحیتوں کو بطریق احسن استعمال نہیں کر سکتے۔

۲۔ پاکستان میں موجودہ بعض قبائل کے درمیان بعض تنازعات صرف اس وجہ سے ہیں کہ ان کی حدود کا تعین موجود نہیں۔ اس ضمن میں حکومت کو چاہیے کہ صحیح علاقائی تقسیم کرے اور غاصبانہ قبضے ختم کرائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبائل کے درمیان علاقائی تنازعات کو ختم کیا اور غاصبانہ قبضوں کے خاتمے کے لیے نہایت اہم کردار ادا کیا۔(۹)

۳۔ پاکستان میں بسنے والے تمام قبائل و اقوام کے حقوق کا صحیح اور عادلانہ تعین کیا جائے' مثلاً ملازمتوں میں کوٹہ سسٹم اور دیگر حقوق کے صحیح تعین نہ ہونے کی وجہ سے سندھی' پنجابی اور مہاجر عصبیتوں کا مسئلہ سنگین نوعیت اختیار کرتا جا رہا ہے اور داخلی امن و استحکام بھی متاثر ہو رہا ہے۔

۴۔ بین الصوبائی انتظامی محکموں کے اختیارات و فرائض کا صحیح تعین کیا جائے۔ صوبوں کے حقوق کی عادلانہ تقسیم کی جائے' مثلاً پانی اور بجلی کی رائلٹی اور اس جیسے کئی دیگر مسائل ایسے ہیں جن کی وجہ سے بین الصوبائی تعصب اور سیاسی عدم استحکام کی راہ ہموار ہوتی ہے۔

عدل و انصاف کی بلا امتیاز فراہمی : جس معاشرے میں انصاف کے حصول میں سیاسی و انتظامی مداخلت عام ہو' رشوت و سفارش سے فیصلے تبدیل کیے جا سکتے ہوں اور کمزور کے حقوق کو دبایا جا سکتا ہو' وہاں پر امن و آشتی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔(۱۰) مساویانہ عدل کی فراہمی حکومت کی بنیادی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ مساویانہ انصاف کی فراہمی کے سلسلے میں اسلام نہایت تاکید کے ساتھ تلقین کرتا ہے۔(۱۱) حق و انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنے کو ایمان باللہ کے بعد سب سے زیادہ قوی فرض قرار دیا گیا ہے۔(۱۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصاف رسانی کا انتہائی مستحکم ادارہ قائم فرمایا جس کے تحت ہر بڑے چھوٹے' امیر و غریب اور شاہ و گدا کو عدل کی بنیادوں پر انصاف مہیا کیا جاتا تھا۔ سب کے لیے ایک قانون رکھا گیا تھا۔ قاضی کی عدالت میں بادشاہ پر بھی مقدمہ دائر ہو سکتا تھا۔ اس کی مثال خود نبیؐ نے قائم فرمائی۔ چنانچہ ایک مرتبہ اپنی آخری عمر میں آپؐ نے اعلان فرمایا کہ مجھ پر کسی کا حق ہو تو وہ طلب کر لے اور جس کسی کو مجھ سے تکلیف پہنچی ہو' وہ مجھ سے انتقام لے لے۔(۱۳)

یہی وہ مساویانہ عدل و انصاف تھا جس کے تحت آگے چل کر خلفاے راشدین اپنے گورنروں اور اعمال کا بلاجھجک احتساب کرتے اور عام لوگ بھی عدالت کے ذریعے ان سے اپنے حقوق کا مطالبہ کر سکتے تھے۔(۱۴) آپؐ نے انصاف رسانی کو ایک مرکزی ادارے کا درجہ عنایت فرمایا جس میں بلاتفریق انصاف مہیا کیا جاتا تھا۔ چنانچہ لوگوں نے حصول انصاف کے لیے قبیلوں کا سہارا لینا ترک کر کے آپؐ کی طرف رجوع کیا حتیٰ کہ غیر مسلم بھی آپؐ سے بخوشی فیصلے کرانے لگے۔(۱۵) اس طرح عرب میں معاشرتی امن کا دور دورہ ہوا۔

۱- پاکستان میں بلاامتیاز عدل و انصاف کے حصول کو آسان بنایا جائے تاکہ لوگ اپنی قوموں' قبیلوں اور تنظیموں کا سہارا لینا ترک کر دیں۔

۲- پاکستان میں عدلیہ بعض معاملات میں سیاسی نمایندوں اور انتظامیہ کے دباؤ میں ہوتی ہے۔ اس طرح عدلیہ کا صحیح مقصد یعنی مساویانہ انصاف پورا نہیں ہوتا۔(۱۶) لہٰذا حکومت کو چاہیے کہ عدلیہ کو سیاسی تصرف اور انتظامیہ کے دباؤ سے مکمل طور پر آزاد کرے۔ کسی طاقت ور کو قانون سے بالاتر قرار نہ دیا جائے۔ موجودہ پاکستانی قانون میں صدر' وزیراعظم' وزراے اعلیٰ اور گورنر وغیرہ پر عام آدمی فوجداری مقدمہ دائر نہیں کر سکتا۔(۱۷) ایسے قوانین کو درست کیا جائے۔

۳- ملک میں قرآن و سنت کو سپریم لا کا درجہ دیا جائے۔(۱۸) یہ قانون منظور کیا جائے کہ دستور کی کوئی ایسی پالیسی یا تعبیر معتبر نہ ہوگی جو قرآن و سنت کے خلاف ہو۔

۴- ہر سطح کے لیے قرآن و سنت اور پرانے اسلامی فیصلوں کی تدریس کا مناسب بندوبست کیا جائے۔

مقاصد کا واضح تعین اور ان کے حصول میں قومی یک جہتی: جس قوم کے سامنے صحیح اور واضح مقصد نہیں ہوتا' وہ مکمل یک جہتی سے اپنی منزل کی طرف رواں نہیں ہو سکتی اور جلد ہمت ہار جاتی ہے۔ رسولؐ اللہ اور ان کے متبعین کے سامنے اسلامی ریاست کا جو واضح اور صحیح مقصد تھا' وہی ہمارا مقصد بھی ہونا چاہیے۔ پاکستان اس لیے قائم کیا گیا تھا کہ یہاں اسلامی تہذیب و تمدن کی نشوونما آسانی سے ہو سکے گی اور اسلامی معاشرتی نظام کا قیام ممکن ہو گا اور پھر یہی نظام پوری دنیا میں قائم ہو سکے گا۔ دور حاضر میں پاکستان کی نظریاتی اساس کو بھلایا جا رہا ہے۔ میڈیا اور نصاب تک میں اس نظریاتی اساس کو ختم کرنے کی سازشیں ہو رہی ہیں۔ نئی نسل کو ظاہری چمک دمک میں الجھا کر' ان کی حقیقی شناخت کو ان سے چھینا جا رہا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ پاکستان کے مقاصد اور تقاضوں کا بھرپور پرچار کیا جائے۔ ان عقائد و نظریات اور اخلاقی اقدار سے قوم کے ہر طبقے کو ایک مرتبہ پھر متعارف کرایا جائے جو پاکستان کی نظریاتی بنیاد کا درجہ رکھتے ہیں۔

معاشی استحکام: انسان کی اولین ضروریات اس کی معیشت سے شروع ہوتی ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام کے وقت سے ہی اللہ تعالیٰ نے ان بنیادی ضرورتوں کے متعلق فرمایا: "بلاشبہ تمہارا یہ حق ہے کہ تم یہاں نہ بھوکے رہو گے اور نہ ننگے۔ اور یہ کہ تم نہ پیاسے رہو اور نہ ہی دھوپ کی تپش اٹھاؤ"۔(۱۹)

قوموں کے استحکام و عدم استحکام میں ان کی معیشت نہایت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ علمی و سائنسی ترقی کے میدان میں بھی وہی قومیں عروج پر پہنچتی ہیں جن کی معیشت مستحکم اور خوشحال ہو وگرنہ بری معیشت انسان کو اپنے اللہ سے بھی دور کر دیتی ہے۔(۲۰)

اسلامی ریاست کے قیام کے ساتھ ہی رسول اکرمؐ نے انفرادی اور قومی سطح پر معاشی استحکام کے لیے انقلابی اقدامات فرمائے مثلاً:

۱۔ غیر مسلموں کے معاشی تسلط سے آزادی۔

۲۔ تجارتی ترقی کے لیے اقدامات۔

۳۔ زراعتی ترقی کے لیے اقدامات۔

۴۔ کفالت عامہ۔

۱۔ **غیر مسلموں کے معاشی تسلط سے آزادی:** عہد نبویؐ کی اسلامی ریاست ابتدا میں معاشی پسماندگی کا شکار تھی۔ مہاجرین مکہ کی تجارت منقطع ہو چکی تھی۔ علاوہ ازیں انصار مدینہ پر پہلے سے یہودیوں کی معاشی بالادستی قائم تھی۔ اس طرح ایک طرف تو مشرکین مکہ سے واسطہ تھا تو دوسری طرف یہود

مدینہ سے جو مدینہ کی تجارت پر چھائے ہوئے تھے اور سودی کاروبار کرتے تھے۔(۲۱)
آپؐ نے غیر قوتوں کے معاشی چنگل سے نکلنے کے لیے مدینہ میں اسلامی تجارت کو فروغ دیا۔(۲۲) زرعی پیداوار میں اضافے کا رجحان پیدا کیا اور سودی کاروبار کا خاتمہ کیا۔ علاوہ ازیں مشرکین اور یہود کی تجارتی اجارہ داری کے خاتمے کے لیے تجارتی راستے پر آباد قبائل سے امن معاہدے کیے۔(۲۳) جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جلد ہی مسلمانوں نے اپنا معاشی اقتدار قائم کر لیا اور غیروں کے تسلط سے آزاد ہو گئے۔

موجودہ حالات میں پاکستان غیر مسلموں کے معاشی تسلط کے زیر بار ہے۔ اس کی معیشت قرضوں پر منحصر ہے۔ معاشی استحکام کے لیے ضروری ہے کہ قرضوں سے نجات حاصل کی جائے، غیر ضروری اخراجات اور شاہی عیاشیوں سے پرہیز کیا جائے۔ پڑوسی ممالک کے ساتھ مضبوط تجارتی تعلقات قائم کیے جائیں۔ حکومت کو چاہیے کہ اسلامی معاشی بلاک اور اسلامک بنک کے قیام کے لیے خصوصی کوششیں کرے۔

تجارتی استحکام: معاشی ترقی و استحکام کے لیے تجارت ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ معیشت کے اس اہم شعبے کی طرف اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ہے بلکہ اس کو اپنا فضل قرار دیا ہے۔(۲۴) عہد نبویؐ میں، اسلامی ریاست کے قیام کے وقت مسلمان تاجروں کی ہجرت کی وجہ سے، ان کی تجارت منقطع ہو گئی تھی۔ دوسری طرف انصار مدینہ زیادہ تر زراعت کے پیشے سے منسلک تھے۔(۲۵) نبی اکرمؐ نے مسلمانوں میں تجارت کے استحکام کے لیے راہ ہموار فرمائی۔ آپؐ نے تجارت و صنعت و حرفت کی خوب ترغیب دی۔ چنانچہ آپؐ نے صنعت و حرفت کو پاک ترین روزی اور تجارت کو بہترین معاش قرار دیا۔(۲۶) آپؐ نے فرمایا کہ جو شخص تجارت کرتا ہے، اس کے یہاں خیر و برکت اور رفاہیت پیدا ہوتی ہے۔(۲۷)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تجارتی ترقی و اصلاح کے لیے عملی اقدامات بھی فرمائے۔ آپؐ نے بازاروں اور منڈیوں پر چند افراد کی اجارہ داری کا سدباب فرمایا۔ اس سلسلے میں آپؐ نے بیع الحاضر للبادی سے منع فرمایا۔(۲۸) آپؐ نے غیر قانونی معاشی اجارہ داری حاصل کرنے والی قوموں کے خلاف عملی اقدامات فرمائے۔(۲۹) آپؐ نے تجارتی بدعنوانیوں کی روک تھام کے لیے مختلف افراد کو بازاروں پر نگران مقرر فرمایا۔(۳۱) آپؐ نے ذرائع نقل و حمل کو آسان بنایا۔ اس سلسلے میں معاہدات فرمائے اور ذرائع نقل و حمل میں مشکلات ڈالنے والوں کے خلاف کارروائی کی۔(۳۲) نبیؐ کے ان اقدامات کا یہ نتیجہ نکلا کہ مسلمانوں نے تجارتی میدان میں خوب ترقی کی اور اس طرح اسلامی ریاست کی معیشت مستحکم ہوئی۔(۳۳)

حکومت کو چاہیے کہ تجارتی بدعنوانیوں، شخصی و گروہی اجارہ داریوں اور بلیک مارکیٹنگ کا سختی سے سدباب کرے۔ علاوہ ازیں سٹہ بازی کے طریق کار کو ختم کرنا چاہیے جس نے باقاعدہ ایک صنعت کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اس کی وجہ سے مال کے ذخیروں پر بازار میں آنے سے قبل ہی درجنوں سودے ہو جاتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ

ہوتا ہے کہ بازار میں مال پہنچنے سے قبل ہی اس کے داموں میں بہت اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس طرح چھوٹے تاجروں اور عوام کو سخت نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ نبی اکرمؐ نے بھی اس طریق کار کی ممانعت فرمائی ہے۔(۳۴) حکومت کو چاہیے کہ سٹاک مارکیٹ میں سٹہ بازی کی ممانعت کرے اور حصص کی حقیقی خرید و فروخت کی اجازت دے۔

بین الاقوامی تجارت کے فروغ کے لیے جو معاہدے کیے جائیں' ملکی مفاد کو پیش نظر رکھ کر کیے جائیں اور ان کو قائم رکھا جائے۔ اس سلسلے کے استحکام کے لیے حکومت کو چاہیے کہ وہ اہم سیاسی جماعتوں کو اعتماد میں لے کر تجارتی معاہدے کرے تاکہ دوسری سیاسی پارٹی برسراقتدار آکر معاہدے کو یکسر ختم نہ کر دے۔ کیونکہ ایسی صورت حال میں ملک کی تجارتی ساکھ کو سخت دھچکا لگتا ہے۔

زرعی ترقی: انسانی تہذیبوں کا ابتدا ہی سے زراعت کے ساتھ واسطہ رہا ہے اور یہ بات مسلمہ ہے کہ جو قوم یا ملک زرعی اعتبار سے خود کفیل ہیں' وہی معاشی ترقی کی راہ پر گامزن بھی ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے زراعت کے تمام شعبوں کی ترقی کے لیے خصوصی اقدامات فرمائے۔ اسلامی ریاست کے قیام کے بعد جلد ہی آپؐ نے مدینہ کی بنجر اور افتادہ اراضی کو سرکاری تحویل میں لے لیا۔ بے کار زمینوں کو آباد کرنے کے لیے' آپؐ نے مختلف اقدامات فرمائے۔ ضرورت مند لوگوں کو زمینیں الاٹ کیں تاکہ وہ انھیں آباد کریں۔(۳۵) آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص کسی مردہ زمین کو آباد کرے وہ اسی کی ملکیت ہے۔(۳۶) آپؐ نے بے کار زمینوں کو آباد کرانے کے لیے جو اقدامات کیے' ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کام کے لیے باقاعدہ تحریک چلائی گئی۔(۳۷)

۱- پاکستان میں جابجا ہزاروں ایکڑ اراضی غیر آباد پڑی ہے۔ ان زمینوں کو سرکاری تحویل میں لے کر اور ملکیت کا فطری محرک دے کر' انھیں غریب ہاریوں اور کاشتکاروں کو دیا جائے۔ اس طرح ملک میں زرعی خود کفالت کی طرف انقلابی ترقی ممکن ہو سکتی ہے۔ اس آباد کاری کے سلسلے میں کچھ مدت متعین کر دی جائے تاکہ اس مدت کے اندر زمین آباد نہ کرنے والوں سے اراضی واپس لے کر دوسروں میں تقسیم کر دی جائے۔ اس ضمن میں ہمارے سامنے حضرت عمرؓ کی مثالیں کار آمد ہیں۔ آپؓ نے تین سال کی مدت میں زمینیں آباد نہ کرنے والوں سے زمینیں واپس لے لی تھیں۔(۳۸)

۲- حکومت کو چاہیے کہ زرعی پیداوار کی نگرانی کرے اور اسے زیادہ واسطوں سے مارکیٹ میں پہنچنے سے روکنے کے لیے اقدامات کرے۔ کاشتکاروں کے لیے مقامی سطح پر بازار لگائے جائیں جہاں وہ اپنی پیداوار کے براہ راست بڑے سودے بھی کر سکیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زراعت کے ایک دوسرے اہم شعبے یعنی حیوانات کی پرورش کے لیے بھی خصوصی اقدامات فرمائے۔ آپؐ نے خود بھی اس شعبے میں دلچسپی لی اور جانور پالے۔ مدینہ میں آپؐ

کے پاس کئی دودھ دینے والی اونٹنیاں اور بکریاں تھیں جن پر آپؐ کے اہل خانہ گزر بسر کرتے تھے۔(۳۷) علاوہ ازیں آپؐ نے اس ضمن میں دوسروں کو بھی ترغیب دی، مثلاً آپؐ نے فرمایا: "جن لوگوں کے ہاں بکری ہے ان کے ہاں برکت ہے"۔(۳۸) اس سلسلے کی ترقی کے لیے آپؐ نے چراگاہوں کی خصوصی حفاظت کا اہتمام فرمایا اور نئی چراگاہوں کو آباد کرنے کی ترغیب دی۔(۴۱) اس کے علاوہ آپؐ نے حمیٰ (چراگاہ) کے درختوں کو کاٹنے سے منع فرمایا۔(۴۲)

۱۔ پاکستان ایک زرعی ملک ہونے کے باوجود زراعت میں بہت پس ماندہ ہے۔ ملک میں زرعی اجناس کی قلت رہتی ہے حتیٰ کہ ملکی سرمایے کے دو ارب ڈالر ہر سال بیرونی ممالک سے زرعی اجناس درآمد کرنے میں خرچ ہو جاتے ہیں۔ زرعی شعبوں میں نبی اکرمؐ کے اقدامات سے استفادہ کیا جائے۔ اس شعبے کو صحیح خطوط پر ترقی دی جائے تو ملکی معیشت خاصی مستحکم ہو سکتی ہے۔

۲۔ باصلاحیت نوجوانوں کو قدرتی صنعتوں کے فروغ کے لیے بلاسود قرضے فراہم کیے جائیں۔ سرکاری سطح پر چراگاہوں اور جنگلات کی صحیح حفاظت کا انتظام کیا جائے۔ کچے کے علاقوں میں جانور پالنے والوں اور دیگر قدرتی صنعتوں کو فروغ دینے والوں پر سے ٹیکس ختم کیے جائیں اور انھیں مزید مراعات دی جائیں۔ اس سلسلے کو ترقی دینے کے لیے میڈیا کے ذریعے اسلامی تعلیمات کے حوالے سے رغبت دلائی جائے۔ ان اقدامات سے ایک طرف بے روزگاری کی شرح میں کمی ہوگی تو دوسری طرف ملک زرعی آمدنی میں خود کفیل ہو جائے گا اور یہ معاشی استحکام کے لیے اہم پیش رفت ہوگی۔

کفالت عامہ: معاشی میدان میں یہ شعبہ خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ اس شعبے کے تحت معاشرے میں معاشی عدم توازن کا آسانی سے خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔ کفالت عامہ کے لیے نبی کریمؐ کے دور میں تین بنیادی اہمیت کے شعبے تھے: (۱) زکوٰۃ، (۲) بیت المال، (۳) عطیات۔

زکوٰۃ: زکوٰۃ کا اہم مقصد یہ ہے کہ صاحب حیثیت لوگوں سے مال لے کر غربا اور معذورین کی کفالت کی جائے۔

حکومت کو چاہیے کہ زکوٰۃ کے نظام کو صحیح معنوں میں نافذ کرے اور اس کے ذریعے غریبوں، یتیموں، معذوروں اور دیگر حاجت مند افراد کی مکمل کفالت کا بندوبست کرے۔

بیت المال: کفالت عامہ کے بندوبست اور دیگر رفاہی امور کی بجا آوری کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت المال کی بنیاد رکھی اور حضرت عمرؓ نے اس نظام کو بہت زیادہ ترقی دی۔(۴۳) مختلف ذرائع سے حاصل شدہ رقوم اور اموال بیت المال میں جمع کیے جاتے تھے۔

موجودہ دور میں کفالت عامہ کے لیے بیت المال اور اس قسم کے دیگر ادارے قائم کر کے انھیں صحیح نہج پر چلایا

جائے تو ایک طرف غربت و افلاس کا قلع قمع ہو گا تو دوسری طرف تقسیم دولت میں بہت حد تک توازن پیدا ہو جائے گا۔ علاوہ ازیں بے روزگاری میں بھی کافی حد تک کمی ہو گی۔

عطیات: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں کفالت عامہ اور قومی مقاصد کے حل کے لیے سب سے زیادہ آمدن عطیات کے ذریعے حاصل ہوتی تھی۔ اسلامی ریاست کو درپیش اکثر مسائل کا حل عطیات سے ہوتا تھا۔ تعلیم و تعلم کا بیشتر سلسلہ بھی عطیات سے چلایا جاتا تھا۔(۴۴) انفرادی اور اجتماعی مسائل کے حل کے لیے عطیات بہت کار آمد ثابت ہوتے تھے، مثلاً حضرت عثمان غنیؓ کے عطیہ پر مدینہ میں میٹھے پانی کا انتظام کیا گیا۔(۴۵) انصار مدینہ نے مہاجرین کی امداد کے لیے اپنی زمینیں اور باغات عطیات کی شکل میں دیے(۴۶)۔ اکثر و بیشتر ہنگامی حالات میں عطیات سے کام چلایا جاتا تھا، مثلاً ہوازن کے چھ ہزار قیدیوں کے لیے کپڑے مسلمانوں کے عطیات کے ذریعے فراہم کیے گئے۔(۴۷) غزوۂ خیبر کے دوران عطیات سے امداد حاصل کی گئی۔ علاوہ ازیں غزوات کا اکثر خرچ عطیات کے ذریعے ہی پورا کیا جاتا تھا۔(۴۸)

موجودہ دور میں زکوٰۃ، بیت المال اور دیگر عطیات کے ذریعے بے روزگاروں کی امداد و معاونت کی طرف خصوصی توجہ دی جائے تو اس سنگین مسئلے کی طرف خاصی پیش رفت ممکن ہے۔ تجارتی ترقی کے لیے بیت المال سے قرض دینے کی مثالیں بھی موجود ہیں۔(۴۹) علاوہ ازیں ان رفاہی اداروں کو ملک سے قرض اتارنے کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ بیت المال اور دیگر عطیات کا جائز اور صحیح استعمال کیا جائے تو ان شعبوں میں بہت زیادہ رقم جمع ہونا کوئی غیر متوقع بات نہیں ہو گی۔

داخلی و خارجی امن و استحکام: ملکی ترقی و استحکام کے لیے یہ ضروری ہے کہ ملک داخلی و خارجی خطرات سے محفوظ ہو۔ جہاں داخلی و خارجی امن کو مسئلہ درپیش ہو، وہاں خوش حالی و ترقی کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

داخلی استحکام کے لیے دو چیزیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں: (۱) امن و امان کا قیام، (۲) اداروں کا درست ہونا۔

(۱) امن و امان کا قیام: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی ریاست کی بنیاد رکھتے ہی داخلی امن کی طرف توجہ فرمائی۔ قوموں کے حقوق و فرائض متعین فرمائے۔ فساد پھیلانے والوں کے خلاف سخت سے سخت کارروائی فرمائی۔(۵۰)

(۲) اداروں کی درستگی: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ریاست میں قائم کردہ تمام شعبوں کے استحکام کی طرف خصوصی توجہ فرمائی۔ زکوٰۃ کا ادارہ ہو یا بیت المال کا، احتساب کا معاملہ ہو یا عدل و انصاف کی فراہمی کا، ہر ادارے کو صحیح اور درست سمت میں چلانے اور خدمت خلق کے راستے پر لانے کا اہتمام فرمایا۔

(۵۱) انتظامی معاملات حل کرنے والے اداروں میں عموماً نبی کریمؐ مقامی آدمیوں کے تقرر کو بہت اہمیت دیتے تھے۔(۵۲) اس لیے کہ مقامی افراد اپنی جگہ کے حالات و مسائل سے اچھی واقفیت رکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں علاقے سے جذباتی لگاؤ اور سماجی دباؤ کے تحت صحیح کام کرتے ہیں۔

۱۔ حکومت کو چاہیے کہ داخلی امن و امان کی بحالی کے لیے ہر ممکنہ اقدامات کرے۔ اداروں کے صحیح استحکام کے لیے نظام احتساب کو درست کیے بغیر چارۂ کار نہیں۔ مقامی سطح کے انتظامی اداروں میں اکثر مقامی لوگوں کو کام کرنے کا موقع دیا جائے۔

۲۔ داخلی امن و سکون کی بحالی کے لیے سماجی اقدامات بھی ضروری ہیں۔ اس ضمن میں محلہ وار کمیٹیاں بنائی جائیں' جن میں اچھی شہرت رکھنے والے پڑھے لکھے ایسے دیانت دار افراد کو رکھا جائے' جن کے دل خدمت خلق اور خوف خدا سے معمور ہوں"۔(۵۳)

خارجی امن و استحکام: ریاست کے داخلی استحکام کو بحال رکھنے کے ساتھ ساتھ بیرونی خطرات سے مدافعت کا انتظام بھی ضروری ہے۔ بیرونی خطرات سے نمٹنے اور جنگ کے امکانات کو کم کرنے کا ایک عام طریقہ یہ ہے کہ فنون حرب میں اتنی ترقی کی جائے کہ دشمن کو حملہ کرنے کی ہمت ہی نہ ہو۔(۵۴) نبیؐ نے جدید ترین ہتھیار حاصل کیے اور استعمال بھی فرمائے۔(۵۵) علاوہ ازیں آپؐ نے فنون حرب کی طرف خاص توجہ فرمائی۔ اس ضمن میں آپؐ نے ان کھیلوں اور ورزشوں کی حوصلہ افزائی فرمائی جو جنگ کے لیے مفید ہو سکتے ہیں' مثلاً نیزہ بازی' تیر اندازی' گھوڑ دوڑ اور تیراکی وغیرہ۔(۵۶) آپؐ نے مخالفین کی دشمنانہ سرگرمیوں کی اطلاع حاصل کرنے کے لیے جاسوسی کا صحیح انتظام فرما رکھا تھا۔(۵۷) خارجی امن و استحکام کے سلسلے کی ایک اہم کڑی آنحضرتؐ کے وہ معاہدے تھے جو آپؐ نے اسلامی ریاست کے قیام کے فوراً بعد کیے۔ دشمن کی ریشہ دوانیوں سے بچنے کے لیے نبی اکرمؐ نے مدینہ کے اطراف میں اہم قبائل سے امن معاہدات کیے۔ یہ معاہدات اسلامی ریاست کے خارجی استحکام میں بہت ہی کارگر ثابت ہوئے۔(۵۸)

۱۔ دفاعی سلامتی کے لیے حکومت کو جدید ترین ہتھیار نہ صرف حاصل کرنے چاہییں بلکہ ان کا ملک کے اندر بھی تیار کرنا ضروری ہے۔

۲۔ ملکی خفیہ سروس کو سیاسی اثرات سے بچا کر پیشہ ورانہ مقاصد کے لیے فعال بنایا جائے۔

۳۔ ہمسایہ ممالک خصوصاً اسلامی ممالک کے ساتھ تعلقات انتہائی بہتر بنائے جائیں۔ اس ضمن میں ملک کی غیر مستحکم پالیسیوں کو استحکام دیا جائے تاکہ سیاسی جماعتوں کی تبدیلی کے ساتھ خارجہ پالیسی میں رد و بدل نہ ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہمارے لیے بہترین معیار ہے۔ انفرادی زندگی گزارنے کا سوال ہو یا اجتماعی فلاح و ترقی کی حریلیں مقصود ہوں' ہمارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی

سیرت طیبہ ہی اسوہ حسنہ ہے۔

حواشی

۱- البقرہ ۲: ۱۷۷' ۱۸۸۔ النساء ۴: ۱۰' ۲۹' ۳۶۔ المائدہ ۵: ۳۳۔ الاسراء ۱۷: ۲۶' ۲۷۔ الھمزہ ۱۰۴: ۱ تا ۳۔

۲- النساء ۴: ۵۴۔ آل عمران ۳: ۱۴۳۔ یوسف ۱۲: ۹۲۔ الانبیاء ۲۱: ۱۰۷۔ الکھف ۱۸: ۲۲ تا ۳۰۔ الحشر ۵۹: ۹۔

۳- مشکوٰۃ المصابیح: باب الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق' طبع لاہور' ص ۴۲۷۔

۴- سنن ابی داؤد: ج ۲' ص ۷۳۰

۵- صحیح مسلم: باب تحریمہ ظلم المسلم وخذلہ

۶- مثالوں کے لیے ملاحظہ ہو۔ ابن سعد: الطبقات الکبریٰ' دار صادر بیروت ۱۴۰۵ھ' ج ۲' ص ۲۹۵' ۳۱۵' ۳۳۵' ۳۵۰۔ بلاذری انساب الاشراف' دار المعارف' مصر' ص ۲۴۳ پر اسد بن زرارہ کی مثال نیز ملاحظہ ہو الکتانی التراتیب الاداریۃ' احیاء التراث العربی بیروت' ج ۱' ص ۱۱۷' ۱۱۸۔

۷- مسلمانوں اور غیر مسلموں کے حقوق کے لیے ملاحظہ ہو' دستور نبوی ابن ہشام: السیرۃ النبویۃ' طبع مصر' ج ۱' ص ۵۰۱ تا ۵۰۴۔ نیز ملاحظہ ہو ڈاکٹر محمد حمید اللہ: مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ' وثیقہ نمبر ۱۔ غیر مسلموں کے حقوق کے لیے ملاحظہ ہو نبیؐ کا مکتوب بطرف نجران ابو یوسف "کتاب الخراج" طبع بولاق' ص ۷۸ تا ۷۹' نیز مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ' وثیقہ نمبر ۵۱' ۱۰۵' ۱۰۹۔

۸- ملاحظہ ہو دستور مدینہ ---- مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ' وثیقہ نمبر ۱۔

۹- مثالوں کے لیے ملاحظہ ہو نبیؐ کا خط' قبیلہ بنو طے کے نام' قبیلہ بنو اسد کے نام جس میں ان کو سختی سے تاکید کی گئی کہ فلاں فلاں علاقے بنو طے کے ہیں' ان میں قطعاً تصرف نہ کیا جائے۔ نیز نبیؐ کا مکتوب برائے اہل "ایلہ" جس میں سختی سے تاکید کی گئی کہ مقناء والوں کو ان کے اپنے علاقوں میں آباد کیا جائے اور ان کے علاقے سے تصرف ختم کیا جائے۔ ملاحظہ ہو بالترتیب مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ' وثیقہ نمبر ۱۹۳' ۱۹۴' ۲۰۲۔ بلاذری فتوح البلدان' طبع لیڈن' ۱۸۶۶' ص ۶۰

۱۰- نبوی اصول کے لیے ملاحظہ ہو بنو مخزوم کی فاطمہ نامی عورت کا واقعہ صحیح البخاری' کتاب الحدود باب کراہیۃ الشفاعۃ فی الحدود۔ والذی نفس محمد بیدہ لو ان فاطمۃ بنت محمد سرقت لقطعت یدھا (اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمدؐ کی جان ہے اگر فاطمہ بنت محمد بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا)۔

۱۱- النساء ۴: ۱۳۵۔ ۱۲- السرخسی' المبسوط' ج ۲۶' ص ۵۹۔

۱۳- مصنف عبدالرزاق' طبع بیروت ۱۹۷۲' ج ۹' ص ۴۶۹۔

۱۴- کنز العمال' طبع بیروت' ص ۲۷۳' پھر مزید مثالوں کے لیے ملاحظہ ہو' ج ۱۲' ص ۱۵۹' ج ۱۳' ص ۸۳۔

۱۵- سنن ابو داؤد' طبع مکتبہ امدادیہ ملتان' ۱۳۱۶ھ' ج ۲' ص ۱۵۴' ۲۹۲' ۲۹۳۔

۱۶- الشوریٰ: ۱۵' المائدہ ۵: ۴۳۔ ۱۷- دستور پاکستان' فاروق اختر نجیب' ص ۳۵۳۔

۱۸- النساء ۴: ۱۰۵' المائدہ ۵: ۴۳' ۴۵' ۴۷۔ ۱۹- طٰہٰ ۲۰: ۱۱۸' ۱۱۹۔

۲۰- مشکوٰۃ المصابیح' باب الاستعاذہ۔

۲۱- مدینہ کے بازاروں میں اکثر یہود کا راج تھا۔ یہودی تاجر ابو رافع کو پورے حجاز کے تاجر کا لقب دیا گیا تھا۔ صحیح البخاری' کتاب المغازی' باب قتل ابو رافع' قدیمی کتب خانہ' کراچی ۱۳۸۱ھ' ج ۲' ص ۵۷۷۔
۲۲- ملاحظہ ہو عبدالرحمٰن بن عوف کی تجارت کی مثال' بخاری: ج ۱' ص ۵۶۱۔ مزید مثالوں کے لیے ملاحظہ ہو مسند احمد: ج ۱' ص ۶۳' ج ۳' ص ۳۴۷' ابن سعد: ج ۲' ص ۵۹' ۶۰' ج ۳' ص ۱۳۰۔
۲۳- ابن سعد: ج ۲' ص ۸' ۱۰' بلاذری فتوح البلدان' ص ۲۸۷۔
۲۴- الجمعہ ۶۲: ۱۰۔ ۲۵- کتاب المزارعۃ' ج ۱' ص ۳۱۳ نیز کتاب المساقاۃ' ج ۱' ص ۳۲۰۔
۲۶- مشکوۃ المصابیح: کتاب البیوع' باب الکسب۔
۲۷- کنز العمال: الفصل الثالث فی انواع الکسب وادابہ۔
۲۸- اس طرح شہر کے افراد دیہات سے سستے داموں اشیا خرید کر انتہائی مہنگے داموں فروخت کرتے ہیں۔ صحیح مسلم: کتاب البیوع۔
۲۹- نبیؐ کو جب پتا چلا کہ عرب کے تجارتی قافلوں کی راہ میں دومۃ الجندل والے رکاوٹیں کھڑی کر رہے ہیں تو آپؐ نے اس سرحدی علاقے کی طرف مہم بھیجی اور اس سلسلے کو ختم کرایا۔ ابن سعد: ج ۲' ص ۶۲ نیز مسعودی: التنبیہ والاشراف' دار صعب بیروت' ص ۲۱۵۔
۳۰- صحیح مسلم: کتاب المساقاۃ والمزارعۃ' مستدرک حاکم: ج ۲' ص ۱۲۔
۳۱- اسد الغابہ: ج ۳' ص ۶۔ الکتانی: التراتیب الاداریہ' ج ۱' ص ۲۳۱' ۲۸۷ نیز ملاحظہ ہو الاصابہ: ج ۲' ص ۴۷' سیرۃ الحلبیۃ: ج ۳' ص ۳۲۴۔
۳۲- ملاحظہ ہو حوالہ نمبر ۲۹۔
۳۳- بخاری: ج ۱' ص ۵۶۱' مسند احمد: ۱/ ۶۳' ۳/ ۳۴۷' ابن سعد: ج ۳' ص ۱۳۰' ۱۶۰۔
۳۴- مشکوٰۃ المصابیح: باب النھی منھا من البیوع۔
۳۵- کتاب الاموال' ابوعبید ۲۷۸
۳۶- مردہ زمین سے مراد وہ زمین ہے جو زراعت کے قابل ہو اور نہ ہی تعمیر کے۔ سیم و تھور والی زمینیں بھی اسی ضمن میں شامل ہیں۔ ابو یوسف: کتاب الخراج' ص ۶۵' ۶۷۔ سیوہاروی: اسلام کا اقتصادی نظام' ص ۲۴۷۔
۳۷- ابوداؤد' ج ۲' ص ۸۱' ۸۲۔ ابو یوسف: ص ۶۵۔
۳۸- ابویوسف: ۶۱' بیہقی: ج ۶' ص ۱۳۹۔
۳۹- بخاری: کتاب الاجارہ' طبری: ۲/ ۳۲۱' ۳۲۳۔
۴۰- ابن سعد: ج ۲' ص ۲۸۱۔
۴۱- ابن ماجہ: باب المزارعۃ' ص ۱۸۰' ابوداؤد: ج ۲' ص ۸۳' ابویوسف: کتاب الخراج' ص ۱۲۴۔
۴۲- مسلم: ج ۲' کتاب المساقاۃ والمزارعہ' ابو یوسف' ص ۱۲۴' بلاذری: فتوح البلدان' طبع قاہرہ' ص ۳۔
۴۳- زاد المعاد: ابن قیم' ج ۱' ص ۲۲۔ نیز خطبات بہاولپور ڈاکٹر حمید اللہ' ادارہ تحقیقات اسلامی' ص ۱۸۳۔
۴۴- خطبات بہاولپور' ادارہ تحقیقات اسلامی' ص ۲۶۹ تا ۲۷۱۔

۴۵- بلاذری : انساب الاشراف، قاہرہ ۱۹۵۹، ج ۱، ص ۵۳۴، مزید تفصیل کے لیے الکتانی: ج ۱، ملاحظہ ہو وقف کا بیان۔

۴۶- بخاری : باب بنیان الکعبۃ، ج ۱، ص ۵۴۱، نیز یاقوت : المعجم البلدان، دار صادر بیروت، ج ۵، ص ۸۶، ابن سعد: ج ۱، ص ۲۳۸۔

۴۷- واقدی: المغازی، ص ۹۵۴۔ ۴۸- ایضاً، ص ۳۵۲، ۵۰۰، ۵۴۷۔

۴۹- موطا امام مالک: کتاب القراض، ابن سعد: ج ۳، ص ۲۷۸۔

۵۰- ملاحظہ ہو دستور نبویؐ مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ، وثیقہ نمبر ۱، نیز ابن ہشام : ج ۲، ص ۴۷، ۴۹، ۳۲۸، ۳۳۱۔

۵۱- اداروں کے استحکام و درستی کے لیے آپؐ احتساب فرماتے تھے۔ ابوداؤد : کتاب القضا، باب فی طلب القضاء والتسرع الیہ، ج ۲، ص ۱۴۸، صحیح البخاری : کتاب الزکوٰۃ، باب قول اللہ والعاملین علیہا ومحاسبۃ المصدقین، ج ۱، ص ۲۰۳، کنز العمال: طبع بیروت، ج ۱۲، ص ۶۵۹۔

۵۲- بلاذری: انساب والاشراف، ص ۵۳۰، ۵۳۱، ابن سعد : ج ۱، ص ۳۰۰، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۵۵، التراتیب الاداریۃ : طبع بیروت، ج ۱، ص ۲۴۲، ۳۹۶، ۳۹۸۔

۵۳- اسی سے ملتا جلتا ایک نظام عہد نبویؐ اور عہد فاروقیؓ میں "عرافہ" اور "نقابہ" کے اداروں کی شکل میں موجود تھا جو داخلی امن و استحکام کے لیے انتہائی کارآمد ثابت ہوا۔ ابن حجر: فتح الباری، ج ۳، ص ۱۶۹، دار نشر الکتب الاسلامیہ، لاہور، ابن ہشام : ج ۱، ص ۴۴۳، طبری: تاریخ الرسل والملوک، دار المعارف قاہرہ، ج ۳، ص ۴۸۸۔ عہد نبویؐ کے عرفاء کی ذمہ داریوں کے لیے ملاحظہ ہو۔ صحیح البخاری : باب العرفاء الناس، ج ۲، ص ۱۰۶۴۔

۵۴- الانفال ۸ : ۶۰۔

۵۵- السہیلی : الروض الانف، فصل ذکر تعلیم ابن الطائف، المقریزی : امتاع الاسماع ص ۴۱۸، مطبع التالیف ۱۹۴۱۔

۵۶- خطبات بہاولپور : ۲۳۲۔

۵۷- التراتیب الاداریۃ : ج ۱، ص ۲۹۲، ۲۹۳، ۳۶۱۔ طبع رباط۔ ابن ہشام نے لکھا ہے کہ قبیلہ بنو خزاعہ آپؐ کے لیے جاسوسی بھی کرتا تھا۔ السیرۃ النبویۃ : ج ۲، ص ۳۱۲، طبع مصر۔ شامی میں ہے کہ غزوۂ خندق کے محاصرے میں قریش کی مسلمانوں کے خلاف جنگی تیاریوں کی اطلاع بھی بنو خزاعہ نے نبیؐ تک پہنچائی تھی۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ، رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی، ص ۲۸۹، دارالاشاعت، کراچی ۱۹۸۰۔

۵۸- ملاحظہ ہو اہم قبائل مثلاً بنو ضمرہ، بنو مدلج، بنو غفار، بنو اسلم، بنو جہینہ، مزینہ، بنو اشجع، بنو کلب اور بنو خزاعہ کے ساتھ معاہدات نبویؐ۔ ابن ہشام: ج ۲، ص ۳۱۸، ابن سعد: ج ۱، ص ۲۷۱۔ ج ۲، ص ۸، ۱۰، ۴۴۔ ابن حبیب، المحبر، ص ۱۱۱، طبع سعودی عرب۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی یاد میں

خورشید احمد

سرود رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارے ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

۱۵ دسمبر ۱۹۹۷ء ---- میں اسلام آباد میں 'انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز' میں اپنے دفتر میں کام میں مصروف تھا کہ برادرم راؤ محمد اختر نے یہ افسوس ناک خبر سنائی: "مولانا امین احسن اصلاحی کا انتقال ہو گیا" ---- انا للہ وانا الیہ راجعون! میرے قلب کی گہرائیوں میں ایک طوفان سا برپا ہو گیا اور زبان سے بے ساختہ وہی الفاظ نکلے جن سے امام عصر تقی الدین ابن تیمیہؒ کے انتقال پر قاہرہ سے دمشق تک در و دیوار گونج اٹھے تھے ---- صلوا علی ترجمان القرآن' آؤ اس دور کے قرآن کے ترجمان کے لیے نماز مغفرت ادا کریں۔

مولانا امین احسن اصلاحی سے میرا تعارف ۵۰-۱۹۴۹ میں ہوا۔ پہلے ان کی کتابوں سے اور پھر خود ان سے (۱۹۵۰ میں ان کی رہائی کے بعد) کہ اس زمانے میں وہ تحریک اسلامی کے دوسرے قائدین کے ساتھ نظام اسلامی کے مطالبے کی پاداش میں جیل میں تھے۔ میں نیا نیا تحریک اسلامی سے متعارف ہوا تھا۔ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ کے نام سے تو بچپن سے واقف تھا کہ والد محترم ان کے بہت پرانے دوستوں میں سے تھے اور خود مجھے اپنے بچپن میں ان کی زیارت کرنے اور ان کو ایک قومی نظم سنانے کا شرف حاصل تھا اور پھر مارچ ۱۹۴۸ میں ان کی گرفتاری سے قبل ان کے پیچھے خود اپنے گھر میں (مسلم ٹاؤن لاہور' جہاں وقتی طور پر ہجرت کے بعد ہمارا خاندان مقیم تھا) نماز مغرب ادا کرنے کی سعادت حاصل ہو چکی تھی' لیکن اس وقت تک ان کے رفقا اور پیغام سے کوئی واقفیت نہ تھی۔ ان سے نیا رشتہ اس وقت جڑا جب میں اسلامی جمعیت طلبہ کی طرف کھنچا۔ خطبات اور تنقیحات نے دل و دماغ میں ایک ہلچل پیدا کر دی۔

روایتی مذہب کے مقابلے میں دین کے اس انقلابی پیغام نے میرے قلب و نظر کو ایک بالکل نئے وژن سے روشناس کیا اور جمعیت کی بعیت میں ایک نئی زندگی کی تعمیر کے خواب نے خون کو گرمانے' اور خوب تر کی تلاش میں سرگرداں رہنے کا داعیہ دیا۔ نئے نمازی کی طرح ہر دوسری چیز کے مقابلے میں اب تحریک اسلامی کے لٹریچر میں انہماک تھا اور ایک کے بعد دوسری کتاب کی تلاش! جمعیت کی لائبریری میں جتنی کتابیں تھیں سب ہی کو چاٹ ڈالا۔ ترجمان القرآن' چراغ راہ اور کوثر اوڑھنا بچھونا ہو گئے۔ نئے شماروں کا انتظار ہی نہیں' پرانے پرچوں کی تلاش اور ان کے حرف حرف کا مطالعہ پسندیدہ مشغلہ بن گیا۔ اللہ کی رحمتیں ہوں چودھری غلام محمد مرحوم (ف جنوری ۱۹۷۰) پر کہ انھوں نے اپنے ذاتی کتب خانے تک میرے لیے رسائی آسان بنا دی اور جمعیت کے پروگراموں کے لیے تیاری نے شوق پر ذمہ داری کی سان چڑھا دی۔

یہی وہ زمانہ ہے جب مولانا مودودی کی کتب کے ساتھ مولانا امین احسن اصلاحی کی تحریروں تک رسائی ہوئی۔ سب سے پہلے' حقیقت شرک پڑھی جس نے روایتی مذہبیت کے بتوں کو پاش پاش کر دیا۔ مغرب کے مذہبی مفروضوں پر ضرب لگائی۔ شرک سے توحید کے سفر کی جو تاریخ انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا اور گولڈن بوہ (Golden Bough) میں پڑھی تھی اس کی دھجیاں اڑ گئیں۔ سفر ہدایت کے آغاز کو توحید اور خوف کے مقابلہ میں نعمت اور ایک منعم کے قرآنی تصور کی شکل میں محکم دلائل اور مسحور کن انداز بیان کے ذریعے سمجھنے کا موقع ملا۔ حقیقت توحید اور حقیقت تقویٰ کا مطالعہ کیا اور دعوت اسلامی اور اس کے مطالبات میں شامل مولانا اصلاحی کی تقریر کو بار بار پڑھا اور اس سے صبر و استقامت اور دعوت و شہادت حق کے مفہوم کو نہ صرف سمجھا بلکہ حرز جان کیا۔ مولانا اصلاحی کے یہ الفاظ تو بس دل میں اتر گئے اور آج تک مصیبت کے ہر لمحے اور آزمایش کی ہر گھڑی میں عزم و ہمت اور شوق و جذبہ کا نوشتہ بن کر آنکھوں کے سامنے رہتے ہیں:

> ابھی یہ تحریک کمزور اور ضعیف ہے۔ لیکن اگر کچھ ذرے اکٹھے ہو گئے اور اللہ تعالیٰ نے ان ذروں میں کبھی گرمی اور حرارت پیدا کی اور ان میں کچھ صلاحیت پیدا ہو گئی' تو کیا عجب ہے کہ اس کمزور گروہ کے ہاتھوں دین کی وہ خدمت انجام پائے جو اللہ کو' اس کے رسولؐ کو اور تمام مومنین کو سب سے زیادہ محبوب ہے۔ اللہ ہمیں اس کام کے لیے سچا خادم بنا دے۔

کوئی جماعت نہ تھی جو اس مقصد خاص کے لیے جدوجہد کر رہی ہو' باطل سے باطل مقاصد کے لیے جماعتیں ہوں' ان کے لیے بڑی بڑی قربانیاں کرنے والے ہوں' لیکن اس آسمان کے نیچے جو سب سے بڑا مقصد ہو' اسی کے لیے کچھ نہ ہو' کس قدر غم انگیز بات ہے۔ اس مقصد کے لیے کچھ خدا کے بندے اکٹھے ہو گئے' سمجھانے اور سمجھنے میں ذرا دیر لگے گی مگر دنیا سمجھے گی ضرور۔ اور اگر نیتوں میں خلوص ہے تو جس وقت شیطان اپنی فوج لے کر نکلے گا تو ہم اس مبارک ذات کے اسوہ کی پیروی کریں

گے جس نے ہزاروں غرق آہن جنگجوؤں کے سامنے تین سو تیرہ بے سروسامان لا کھڑے کیے تھے اور اللہ تعالیٰ نے انھی کے ذریعہ سے حق کا بول بالا کیا تھا۔

پھر اگر اس جدوجہد میں بازی پالی تو فھو المراد، اور اگر دوسری بات ہوئی تب بھی تمام راستوں میں ایک حق ہی کا راستہ ایسا راستہ ہے جس میں ناکامی کا کوئی سوال نہیں۔ اس میں اول قدم بھی منزل ہے، اور آخر بھی، ناکامی کا اس میں گزر ہی نہیں ہے۔ اس کو مان لینے اور اس پر چلنے کا عزم راسخ کر لینے کی ضرورت ہے۔ پھر اگر تیز سواری مل گئی تو نبہا، یہ نہ سہی تو چھکڑے ملیں گے، انھیں سے سفر ہو گا، یہ بھی نہیں تو دو پاؤں موجود ہیں، ان سے چلیں گے، پاؤں بھی نہ رہیں تو آنکھیں تو ہیں، ان سے نشان منزل دیکھیں گے، آنکھیں بھی اگر بے نور ہو جائیں تو دل کی آنکھ تو ہے، جس کی بصارت کو کوئی سلب نہیں کر سکتا بشرطیکہ ایمان موجود ہو۔ اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے)۔

حقیقت یہ ہے کہ میری زندگی کے رخ کو متعین کرنے میں مولانا اصلاحی صاحب کے ان الفاظ کا بڑا دخل ہے۔ یہیں سے تحریک پا کر ہم نے جمعیت کے دستور میں حلف رکنیت کے لیے جس آیت کا انتخاب کیا وہ یہی آیت تھی، یعنی اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ.....)۔ آج تقریباً پچاس سال کے بعد خود مولانا اصلاحی کی زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو صاف نظر آتا ہے جس بات کا انھوں نے مندرجہ بالا الفاظ میں اظہار کیا تھا اور ہم سب کو اس پر کاربند ہونے کی دعوت دی تھی انھوں نے اس پر عمل کر کے دکھا دیا۔ وہ اپنے رب سے اس حال میں ملے کہ سواری پر بھی سفر کیا، چھکڑے پر بھی، جماعت میں رہ کر بھی یہی جدوجہد کی اور جماعت کو چھوڑنے کے بعد بھی، اس راہ پر قدموں سے بھی چلے اور جب صاحب فراش ہو گئے تو آنکھوں کا مرکز و محور اسی کو رکھا اور بالآخر دل کی آنکھ سے اسی روشنی کا طواف کرتے رہے، تاآنکہ اپنے رفیق اعلیٰ کی طرف عازم سفر ہو گئے۔ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاھَدُوا اللّٰہَ عَلَیْہِ (الاحزاب ۳۳:۲۳)، "(بلاشبہ) ایمان لانے میں ایسے لوگ موجود ہیں جنھوں نے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو سچا کر دکھایا"۔ بقول حافظ ؎

دست از طلب ندارم، تا کارِ من بر آید
یا تن رسد بہ جاناں، یا جاں ز تن بر آید

میں دست طلب نہیں ہٹاتا تاآں کہ میرا مقصد پورا نہ ہو جائے [اور وہ مقصد یہ ہے کہ] یا وصال یار ہو جائے، میرا جسم محبوب سے مل جائے یا جسم سے روح نکل جائے۔

تحریک اسلامی میں مولانا مودودی کے بعد جس ہستی نے ہمارے فکر و نظر اور سیرت و کردار کی تعمیر میں سب سے موثر اور فیصلہ کن رول ادا کیا وہ مولانا امین احسن اصلاحی ہی تھے۔ میرے لیے وہ ہمیشہ ایک عظیم

محسن، مربی، استاد، مرشد اور راہنما رہے۔ میرے لیے ہی نہیں تحریک اسلامی کی تین نسلوں کے لیے! تاریخ میں ان کا شمار بیسویں صدی کے اسلامی احیائی فکر کے کلیدی معماروں میں ہو گا۔ افسوس کہ اس سلسلتہ الذھب کی وہ آخری کڑی تھے۔ ان کے انتقال سے بیسویں صدی کے اختتام سے تین سال قبل یہ آخری چراغ گل ہو گیا جو بہت بڑی محرومی ہے، لیکن امر ربی کے آگے سر تسلیم خم ہے۔ البتہ یہ یقین اور اطمینان ہے کہ الحمدللہ اس صدی کے اسلامی مفکرین نے اور خصوصیت سے علامہ اقبال، مولانا مودودی، حسن البنا شہید، علامہ حمید الدین فراہی، سید قطب، مالک بن نبی اور مولانا اصلاحی رحمہم اللہ اجمعین نے فکر و عمل کی ایسی شمعیں روشن کر دی ہیں اور ان کے افکار اور دعوت کے زیر اثر پوری دنیا میں ایسی علمی اور عملی اصلاحی تحریکیں برپا ہو گئی ہیں کہ اکیسویں صدی کا آغاز تاریکی میں نہیں روشنی میں ہو رہا ہے۔ ان بزرگوں کا یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں۔ ان کی روحیں سرگوشیاں کر رہی ہیں کہ ؎

ہمیں خبر ہے کہ ہم ہیں چراغ آخر شب
ہمارے بعد اندھیرا نہیں، اجالا ہے

مولانا امین احسن اصلاحی ۱۹۰۴ء میں یوپی (بھارت) میں اعظم گڑھ سے کوئی چار میل دور دریائے ٹونس کے کنارے واقع ایک گاؤں "بمہور" میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق وہاں کے ایک متوسط دینی راجپوت زمیندار گھرانے سے تھا۔ اس گاؤں کی بھی ایک تاریخ ہے۔ یہ ۱۸۵۷ء میں تحریک آزادی کا مرکز رہ چکا ہے۔ انگریزی استبداد کے خلاف جو عوامی تحریک اٹھی، یہ گاؤں اس کا ایک گہوارہ تھا اور انگریز دشمنی یہاں کی فضا اور پانی کا ایک حصہ تھی جسے نومولود امین احسن نے شیر مادر سے حاصل کیا۔ علامہ شبلی نعمانی کا تعلق بھی اسی علاقے سے تھا یعنی اعظم گڑھ اور انھی کی کوشش سے یہ ضلع (اعظم گڑھ) ان کی علمی اور تحقیقی سرگرمیوں کا مرکز بنا۔ ایک قصبے سرائے میر میں ایک مدرسہ، مدرستہ الاصلاح کے نام سے ۱۹۱۱ء میں قائم ہوا جس نے تحریک اسلامی کی تاریخ میں بڑا منفرد کردار ادا کیا۔ روایت ہے کہ علامہ شبلی نعمانی جب علی گڑھ دیوبند اور حتیٰ کہ ندوۃ العلما لکھنؤ سے ان مقاصد کے حصول کے باب میں مایوس ہوئے جو اسلام کی نشات ثانیہ کے سلسلے میں ان کے پیش نظر تھے تو پھر ایک طرف انھوں نے دارالمصنفین اعظم گڑھ پر توجہ دی تو دوسری طرف مدرستہ الاصلاح قائم کیا جس کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا تھا جن میں روایتی دینداری کے مقابلے میں اسلام کا ایسا شعور پیدا کیا جا سکے جو اصلاح اور تبدیلی اور بالآخر اسلامی انقلاب کا ذریعہ بن سکے۔ اس مدرسے میں چن چن کر اچھے اساتذہ کو جمع کیا گیا۔ آخری دور میں مولانا شبلی خود اس کے صدر مدرس تھے اور انھی کی خواہش پر امین احسن جو ایک نہایت ذہین بچہ تھا دس سال کی عمر میں اس مدرسہ میں داخل ہوا۔

دراصل علامہ شبلی کے تعلقات اصلاحی صاحب کے والد جناب حافظ مرتضیٰ احمد صاحب سے نہایت گہرے اور مخلصانہ تھے۔ کم سن امین احسن کے دادا کی خواہش تھی کہ زمیندار کا یہ لڑکا بڑا ہو کر ضلع کچہری میں ملازمت کرے لیکن اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اس کی مشیت یہ نہ تھی کہ یہ بچہ برطانوی سامراج کے نظام کا کل پرزہ بنے، بلکہ اس کا مقدر تو پورے نظام کے خلاف ایک تیغ براں بننا تھا۔ دادا کی خواہش کے برعکس علامہ شبلی کی تحریک پر حافظ مرتضیٰ احمد نے، گاؤں کی ابتدائی تعلیم کے بعد امین احسن کو مدرسۃ الاصلاح کے سپرد کر دیا جہاں تیسرے درجہ میں ان کا داخلہ ہوا۔ اس مدرسہ کے نظم و نسق اور نصاب تعلیم وغیرہ کی نگرانی علامہ شبلی نعمانی بطور خود کرتے تھے اور ان کے بعد ان کے عزیز مولانا حمید الدین فراہی کرتے رہے، گو وہ حیدر آباد میں دارالعلوم کے پرنسپل تھے (جہاں ان سے مستقبل میں تاریخ کے رخ کو موڑنے والے ایک اور ذہین بچہ ابوالاعلیٰ مودودی استفادہ کر رہا تھا اور عربی زبان و ادب اور قرآن فہمی کی ابتدائی منزلیں طے کر رہا تھا)۔ لیکن شبلی نعمانی کے بعد اس مدرسہ کے وہی نگران تھے اور اپنی زندگی کے آخری پانچ سال یعنی ۱۹۲۵ سے ۱۹۳۰ تک علامہ فراہی نے ہمہ وقت اس مدرسہ میں گزارے۔ یہی وہ زمانہ ہے جس میں نوجوان امین احسن اصلاحی نے ان کے شاگرد خاص کی حیثیت سے شب و روز ان کی معیت میں گزارے اور ان کے علم اور طرز فکر کے وارث بنے۔ (مولانا امین احسن صاحب کے علاوہ مولانا اختر احسن اصلاحی فراہی صاحب کے دوسرے شاگرد خاص اور علم و فکر کے امین تھے جو ان کے بعد مدرسۃ الاصلاح کے ذمہ دار بنے)۔

مدرسۃ الاصلاح میں مولانا امین احسن کو مولانا عبدالرحمٰن نگرامی جیسا استاد اور اتالیق میسر آیا جس نے ان کی علمی اور اخلاقی تربیت کی۔ علوم اسلامی اور اجتماعی کے علاوہ عربی، اردو، فارسی اور انگریزی میں اتنی دسترس پیدا کی کہ آئندہ تحقیق و تدبر کی راہیں خود طے کر سکیں، زبان و ادب کا ذوق و شوق پیدا کیا، نیز ان کی تقریری صلاحیتوں کو چار چاند لگائے۔ ۱۹۲۲ میں اٹھارہ سال کی عمر میں مولانا امین احسن اصلاحی مدرسے سے فارغ ہوئے اور تین سال صحافت کی وادی میں جوہر دکھاتے رہے۔ زمانہ طالب علمی ہی میں مضمون نگاری کا آغاز ہو گیا تھا۔ سہ روزہ مدینہ بجنور کے، جس کا مسلمانان ہند کی سیاسی اور ادبی تاریخ میں بڑا اونچا مقام ہے، نائب مدیر مقرر ہوئے اور غالباً دو ڈھائی سال اس سے وابستہ رہے۔ اسی زمانے میں بچوں کے ایک رسالہ "غنچہ" اور مشہور ہفت روزہ "سچ" میں بھی کام کیا۔ یہ ہفت روزہ مولانا عبدالرحمٰن نگرامی اور مولانا عبدالماجد دریا بادی کی نگرانی میں شائع ہوتا تھا اور بعد میں مولانا عبدالماجد دریا بادی کی ادارت میں صدق اور پھر "صدق جدید" کی شکل میں شائع ہوتا رہا۔ کچھ عرصے کے لیے مولانا اصلاحی "الناظر" سے بھی وابستہ رہے جس کے روح رواں ملک کے دو صاحب طرز ادیب یعنی مولانا ظفر الملک علوی اور مولانا عبدالماجد دریا بادی تھے۔ اسی زمانے میں مولانا اصلاحی کے بڑے بہترین تعلقات مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریا بادی

اور مولانا منظور نعمانی سے قائم ہوئے۔

کم لوگوں کے علم میں یہ بات ہے کہ اپنی اس علمی و صحافتی سیاحت کے زمانے میں مولانا امین احسن اصلاحی نے اس دور کی روایت کے مطابق کئی کتب کا ترجمہ بھی کیا۔ ان کی پہلی کتاب ایک عربی ناول کا ترجمہ "ہندوستانی جاسوس" تھی۔ اس ناول میں ایک ہندوستانی جاسوس کی سرگذشت بیان کی گئی ہے جو مصطفیٰ کمال پاشا کو قتل کرنے کے لیے ترکی گیا تھا۔ ترجمہ نہایت سلیس اور انداز بیان شگفتہ ہے۔ پہلا ایڈیشن اخبار مدینہ بجنور کے مکتبہ سے شائع ہوا تھا۔ غالباً اب بھی ہندوستان میں تلاش سے مل جائے۔ اس کے علاوہ مشہور مورخ محی الدین الجیلط کی تاریخ اسلام کا بھی عربی سے اردو میں ترجمہ کیا جو تین جلدوں میں شائع ہوا۔ یہ کتاب بھی مدینہ بجنور نے شائع کی تھی۔ بعد میں مولانا فراہیؒ کی رہنمائی میں اصلاحی صاحب جس علمی اور تحقیقی، اور پھر مولانا مودودیؒ کی معیت میں دعوتی اور احیائے دین کی جدوجہد میں شریک ہوئے اس کی وجہ سے ان کی یہ ابتدائی تالیفات نظروں سے اوجھل ہو کر بس ایک قصہ پارینہ بن گئیں۔

۱۹۲۵ مولانا اصلاحی کی زندگی میں ایک فیصلہ کن موڑ ہے جب صحافت کو خیرباد کہہ کر وہ اپنے استاد اور مرشد علامہ حمید الدین فراہی کی خواہش پر ہمہ وقت مدرستہ الاصلاح سے وابستہ ہوئے اور پھر دن رات ان کی خدمت میں رہے اور ہر لمحہ ان کے علوم و فیوض سے استفادہ کیا اور عمر و سال کے فرق کے باوجود علمی اور معنوی حیثیت سے اس طرح استفادہ کیا کہ ؎

من تو شدم تو من شدی، من تن شدم تو جان شدی
تا کس نہ گوید بعد ازیں، من دیگرم تو دیگری

میں نے تیرا قالب اختیار کر لیا ہے اور تو میرے قالب میں آگیا ہے۔ میں جسم ہوں، تو اس کی روح ہے۔ اس کے بعد کوئی یہ نہ کہے گا کہ میں اور چیز ہوں اور تو دوسری چیز ہے۔

علامہ حمید الدین فراہی مرحوم ان نادرہ روزگار شخصیات میں سے تھے جو اگر ایک طرف اسلامی اور جدید علوم کے جامع تھے تو دوسری طرف قدرت نے انھیں اپنے فیض خاص سے نوازا تھا۔ صرف ذہن رسا ہی نہیں بلکہ اعلیٰ اخلاق کا نمونہ اور فکر و تہذیب کے رخ کو موڑنے کا داعیہ بھی دیا تھا۔ ان کے اساتذہ میں علامہ شبلی نعمانی، مولانا فیض الحسن سہارنپوری (شارح حماسہ) اور مولانا فاروق چریا کوٹی جیسے فلسفی اور متکلم تھے۔ پھر علی گڑھ یونی ورسٹی میں انھوں نے جدید علوم کی تعلیم حاصل کی اور بقول مولوی عبدالحق: وہ علی گڑھ یونی ورسٹی کے ذہین ترین اور متقی ترین طالب علم تھے۔ انھوں نے اپنی محنت سے عربی، فارسی، انگریزی اور عبرانی پر ماہرانہ قدرت حاصل کی۔ ادب، فلسفہ، تاریخ اور علوم القرآن میں ان کو تخصص حاصل تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں قرآن پر غور کرنے، اس کے اسلوب کو سمجھنے اور معانی تک پہنچنے کا خاص ملکہ عطا کیا تھا۔ ان

کی تحقیق کا ایک خاص انداز تھا اور "ذبیح کون" میں اس کا ایک شان دار نمونہ پایا جاتا ہے۔ ۳۰-۳۵ سال انھوں نے صرف قرآن پر تدبر کرنے' اس کے نظم کو سمجھنے اور نظم قرآن کی چابی سے اس کے معانی کو پا جانے اور بہت سے بند قفلوں کو کھولنے میں صرف کیے۔

علامہ فراہی نے متعدد بیش قیمت رسائل لکھے (جن کا ترجمہ مجموعہ تفاسیر فراہی کے نام سے مولانا اصلاحی کے قلم سے شائع ہو چکا ہے) لیکن اپنے حاصل مطالعہ و تفکر کو وہ پوری طرح صفحہ قرطاس پر منتقل نہ کر سکے۔ اس لیے ان کی خواہش تھی کہ وہ اس علم کو اپنے شاگردوں کے ذریعہ آنے والی نسلوں تک منتقل کر دیں۔ یہ سعادت مولانا امین احسن اصلاحی اور ایک حد تک الاصلاح کے پرنسپل مولانا اختر احسن اصلاحی اور دوسرے اساتذہ کو حاصل ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا امین احسن اصلاحی نے فراہی صاحب کے انتقال (نومبر ۱۹۳۰) کے بعد اپنی زندگی استاد کے افکار کی حفاظت اور طباعت و اشاعت' ان کی تحریروں کے ترجمہ و تسوید اور ان کے اصول تفسیر کی روشنی میں قرآنی مطالب پر مزید غور و فکر اور ان کی تعلیم' تدریس اور تشہیر کے لیے وقف کر دی۔ تدبر قرآن کو گہری نظر سے پڑھنے والا ہر شخص گواہی دے گا کہ شاگرد نے استاد سے وفاداری کا حق بھی ادا کیا اور ان کے دکھائے ہوئے نشان ہائے منزل کی روشنی میں نئی راہیں تلاش کیں اور نئی رفعتیں بھی حاصل کیں۔

قرآن سے مولانا اصلاحی کا شغف والہانہ بھی تھا اور تدبرانہ بھی۔ وہ اس بااثر کلام کے عاشق تھے اور اس کی گہرائیوں میں غوطہ زنی ان کا محبوب ترین مشغلہ۔ مطالعے کے معاملہ میں اصلاحی صاحب کا ایک خاص ذوق تھا۔ وہ بسیار خواندگی کے قائل نہیں تھے۔ جس طرح دوستوں کے انتخاب میں وہ selective تھے اسی طرح کتب کے انتخاب میں بھی۔ ان کی کوشش ہوتی تھی کہ بس چند بنیادی کتب کا بغور مطالعہ کر لیں اور پھر سارا وقت قرآن پر غور و تدبر کے لیے صرف کریں۔ وہ قرآن کے حافظ تو نہ تھے مگر انھوں نے اپنی زندگی اس طرح قرآن کے ساتھ گزاری کہ قرآن ان کے شب و روز کا رفیق بن گیا اور اس کے معانی و مطالب کے استحضار کی یہ کیفیت تھی کہ جب جس مسئلے پر بات کریں معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک مدت سے اسی پر تحقیق کر رہے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ جمعیت کے دور میں کئی بار ایسا ہوا کہ ہم نے ان سے درس کی درخواست کی اور انھوں نے آنکھ بند کر کے قرآن کو کھولا اور جہاں سے کھل گیا وہیں سے درس شروع کر دیا اور علم و حکمت کے موتی برسانے لگے۔ یا ہم نے ان کے اجتماع میں تشریف لانے کے بعد کسی خاص حصے کے درس کی خواہش کی تو بلاتکلف اس حصے کا درس اس طرح دیا گویا گھنٹوں بلکہ دنوں کی تیاری کے بعد درس دے رہے ہوں۔ اس طرح ۱۹۵۱ اور ۱۹۶۸ کے دوران مجھے بارہا ان کے دروس میں حاضری اور انفرادی طور پر قرآن کے بارے میں اپنے سوالات ان کی خدمت میں پیش کرنے اور ان سے رہنمائی لینے کا موقع ملا۔ اس دوران قرآن سے ان کے شغف' اس کے معانی پر ان کی گرفت اور علوم قرآنی کے ادراک اور استحضار کی جو کیفیت

میں نے دیکھی وہ بے مثال تھی۔ ویسے تو ہر وقت ہی ان کا ذہن قرآن کے رموز کو تلاش کرنے میں مصروف رہتا تھا لیکن خصوصیت سے رات کی تنہائی میں اور صبح کی ضوفشانیوں میں۔ ان کا معمول تھا کہ عشا کے بعد آرام فرماتے اور فجر سے پہلے اٹھ کر نوافل پڑھتے اور اول وقت نماز ادا کر کے ٹہلتے تھے اور انھی لمحات کو انھوں نے قرآن کے لیے خاص کر رکھا تھا۔ بلاشبہ مولانا اصلاحی کا مطالعہ بھی وسیع تھا اور ان کا حال یہ تھا کہ۔

یوں لائے واں سے ہم دل صد پارہ ڈھونڈ کر
دیکھا جہاں کہیں کوئی ٹکڑا اٹھا لیا

لیکن ان کا اصل دین (contribution) قرآن پاک پر اپنے مخصوص انداز میں غور و فکر اور تدبر و تعقل ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس نے ان کی تحریر و تقریر کو ایک انفرادی شان دی۔ ان کی پوری زندگی کا محور و مرکز قرآن ہے! تدبر قرآن کے مقدمے میں اصلاحی صاحب کسی عالم جذب میں اپنی اس کیفیت کا اظہار کرتے ہیں۔ ذرا دیکھیے:

میں بلا کسی شائبہ فخر کے محض بیان واقعہ کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ یہ کتاب میری چالیس سال کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ میں نے اپنی جوانی کا بہترین زمانہ اس کتاب کی تیاری میں بسر کیا ہے اور اب اپنے بڑھاپے کی ناتوانیوں کا دور اس کی تحریر و تسوید میں بسر کر رہا ہوں۔ اس طویل مدت میں، میں نے زندگی کے بہت سے اتار چڑھاؤ دیکھے ہیں اور بہت سے تلخ و شیریں گھونٹ حلق سے اتارے ہیں لیکن اپنے رب کا شکر گزار ہوں کہ کسی دور اور کسی حال میں میرا ذہنی و قلبی تعلق اس کتاب سے منقطع نہیں ہوا۔ میں نے اس ساری مدت میں جو کچھ پڑھا ہے اس کو محور بنا کر پڑھا ہے اور جو کچھ سوچا ہے اس کو سامنے رکھ کر سوچا ہے اور جو کچھ لکھا ہے بالواسطہ یا بلاواسطہ اسی سے متعلق لکھا ہے۔ میں نے قرآن حکیم کی ایک ایک سورت پر ڈیرے ڈالے ہیں۔ ایک ایک آیت پر فکری مراقبہ کیا ہے۔ اور ایک ایک لفظ اور ایک، ایک ادبی اور نحوی اشکال کے حل کے لیے ہر اس پتھر کو الٹنے کی کوشش کی ہے جن کے نیچے مجھے کسی سراغ کے ملنے کی توقع تھی۔ اور یہ راز بھی برملا ظاہر کرتا ہوں کہ میں نے کبھی بھی اس کام میں کوئی تکان یا افسردگی محسوس نہیں کی بلکہ ہمیشہ گہری لذت اور نہایت عمیق راحت کا احساس کیا ہے۔ (تدبر قرآن، ج ۱، ص ۴۱) ؎

ہر زماں از غیب جانے دیگر است

(اسے) ہر لمحے غیب سے، ایک نئی زندگی عطا ہوتی ہے

مولانا اصلاحی کے تفسیری کارنامے کا سب سے اہم پہلو قرآن کی تفسیر قرآن سے، اور اس کے معانی کو اس کتاب کے اندرونی ربط اور الفاظ کے معنی کی صحیح تفہیم کے ذریعے متعین کرنا ہے۔ قرآن فہمی کے بیرونی ذرائع سے بھی انھوں نے کماحقہ استفادہ کیا ہے لیکن ان کی منفرد خدمت اس کے اندرونی ذرائع سے بھرپور

استفادہ اور ان کی روشنی میں بات کو اس طرح پیش کرنا کہ قرآن خود بولتا ہوا نظر آتا ہے۔ تدبر قرآن کی ایک منفرد خصوصیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے ایک آیت کا ایک ہی مفہوم متعین کرنے کی کوشش کی ہے اور انھوں نے خود اعتراف کیا ہے کہ "اس تفسیر میں چونکہ میں نے نظم کلام کو پوری اہمیت دی ہے اس وجہ سے ہر جگہ میں نے ایک ہی قول اختیار کیا ہے بلکہ اگر اس حقیقت کو صحیح لفظوں میں بیان کروں تو مجھے یوں کہنا چاہیے کہ مجھے ایک ہی قول اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑا کیونکہ نظم کی رعایت کے بعد مختلف وادیوں میں گردش کرنے کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہ جاتا"۔ اسی طرح بہت سے فقہی اختلافات کی جڑ بھی صاحب تدبر قرآن کی نگاہ میں آیات کو ان کے سیاق و سباق اور مجموعی نظم سے علیحدہ کر کے سمجھنے میں ہے۔ لیکن اگر ہر آیت کا ایک مفہوم متعین ہو جائے تو ان کی نگاہ میں اس سے فقہی اختلافات کو کم کرنے اور امت میں ایک اجتماعیت قائم کرنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔

تفسیر میں لغت کی اہمیت کو تو ہر مفسر نے مانا ہے لیکن مولانا فراہی اور مولانا اصلاحی کے یہاں نزول قرآن کے زمانے کی عربی زبان اور ادب کو جو اہمیت حاصل ہے' وہ منفرد ہے۔ دور جدید کے مفسرین میں علامہ محمد اسد (لیوپولڈ ویس) نے بھی اس کو خصوصی اہمیت دی ہے۔

مولانا فراہی اور مولانا اصلاحی کی فکر میں نظم کی اہمیت بجا' لیکن اس حقیقت کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیے کہ اس کا تعلق صرف طرز فکر اور اسلوب تفسیر سے ہے۔ دونوں کے افکار اور خصوصیت سے ان کے قرآن کے مطالب و معانی کی تشریح کا جو سب سے اہم پہلو ہے وہ قرآن کے پوری انسانیت کے لیے کتاب ہدایت ہونے' اہل ایمان کے لیے ایک مکمل نظام زندگی اور تہذیب و تمدن کا کامل نقشہ فراہم کرنے' فرد اور معاشرے کی تربیت و تزکیہ کے لیے ایک خود کفیل پروگرام دینے' اور دین حق کے قیام اور اسلامی نظام کو عملاً نافذ کرنے کے لیے امت کے لیے ایک واضح منہج کے تعین سے ہے اور یہی وہ چیز ہے جسے بیسویں صدی میں اسلام کی احیائی فکر کا حاصل اور خلاصہ کہا جا سکتا ہے۔

قرآن کے اعجاز کے بے شمار پہلو ہیں اور ہر دور میں ان کو نمایاں کرنے کی کوششیں اہل علم نے کی ہیں۔ مولانا فراہی' مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی نیز عرب دنیا میں سید قطب شہید کی قرآنی خدمات پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک بزرگ نے اپنے اپنے انداز میں اپنے دور کے انسان کا رشتہ اللہ کی کتاب سے جوڑنے اور قرآنی ہدایت کی روشنی میں عصر حاضر کے مسائل کے حل کی راہیں استوار کرنے کے لیے بڑی واضح رہنمائی دی ہے۔ البتہ جو چیز ان چاروں مفکرین کے سوچنے کے انداز اور اسلوب تفسیر میں نمایاں ہے وہ قرآن کے مرکزی موضوع کی تلاش اور اس کے اس پیغام اور محور سے اس کی تمام تعلیمات' احکام' امثال' تاریخی نظائر' انفس و آفاق کی آیات اور دنیا اور آخرت کے احوال کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش ہے۔ ان بزرگوں نے ماضی کے کام کی عظمت اور افادیت کا پورا پورا لحاظ رکھتے ہوئے

قرآن کو خود قرآن کے ذریعے سمجھنے اور قرآن کے پیغام کی روشنی میں انسانیت کی تعمیر نو کا وژن دیا ہے۔ اگر مولانا مودودیؒ کا مخاطب حق کا ایک عام متلاشی اور امت مسلمہ کی وہ سعید روحیں ہیں جو قرآن کی دعوت کی علم بردار بن کر اس کتاب کے مشن اور احکام کی اقامت کا جذبہ اور داعیہ رکھتی ہیں تو مولانا فراہیؒ اور مولانا اصلاحیؒ نے اپنی توجہ کا مرکز ان اہل علم کو بنایا جو قرآن کا تدبر کی نگاہ سے مطالعہ کر سکیں اور امت اور انسانیت کی علمی قیادت و رہنمائی کا فریضہ انجام دے سکیں۔ سید قطب کے سامنے بھی یہی ہدف نظر آتا ہے۔ البتہ انھوں نے عربی زبان کے آہنگ نیز عرب قوم اور اس کے مزاج اور ثقافتی روایت کی روشنی میں بیان کا وہ انداز اختیار کیا جس میں فکر کی سلاست کے ساتھ جذبات کی تہذیب اور انگیخت کا پورا پورا سامان ہو اور ان دونوں قوتوں کے ذریعے وہ قاری کو اس مشن کی خدمت میں سرگرم کر سکیں۔ نیز ان کے اسلوب کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ فی ظلال القرآن کا لکھنے اور پڑھنے والا تھوڑی دیر کے لیے محسوس کرتا ہے کہ جیسے بندہ اپنے محبوب کے خط کو پڑھ رہا ہو اور اس کے حسن پر فریفتہ اور اس کے جاں فزا پیغام پر مسحور ہو۔

ان بزرگوں کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے قرآن پر غور و فکر اور اس کی روشنی میں زندگی کی راہیں استوار کرنے کے لیے نہ صرف یہ کہ واضح اصول مرتب کیے جو عصر حاضر میں قرآن فہمی کے لیے باب کشا ہیں بلکہ انگلی پکڑ کر قرآن کے طالب علم کی راہنمائی ان خطوط کی طرف کر دی جن کے ذریعے ایک طرف آج کا انسان قرآن کے جوہر کو پالے تو دوسری طرف قرآن کی عظمت اور انسان ساز اور تاریخ گر قوت کے سہارے آج ہی نہیں بلکہ مستقبل میں بھی انسانی زندگی کی تشکیل جدید کر سکے۔

مولانا فراہیؒ اور مولانا اصلاحیؒ کے کام کو اس سلسلے میں ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ میں نے جتنا بھی غور کیا، محسوس کیا کہ ان کا اصل کارنامہ ان دو نکات میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

اولاً انھوں نے آج کے قرآن کے طالب علم کے لیے قرآن فہمی کا وہ راستہ اختیار کیا جس کے نتیجے میں قرآن کی دعوت، پیغام اور ہدایت و رہنمائی کا (contextualization) خود قرآن، الہامی ہدایت کی وسیع تر روایت، دور نزول قرآن کے زبان و ادب اور دور رسالت مآبؐ سے آج تک کے لیے سنت اور شاہراہ ہدایت کے تواتر اور فکری اور عملی تسلسل کے فریم ورک میں کیا جا سکے۔ اس طرح اس کی آفاقیت اور ابدیت کے وہ پہلو نمایاں ہوئے جو اللہ کی کتاب کو کسی خاص عہد کے احوال و ظروف کے مقابلے میں انسانیت کی ابدی ضروریات کے لیے آفتاب ہدایت بناتے ہیں۔

ثانیاً، چودہ سو سال میں جو تفسیری لٹریچر امت کے اہل علم نے تیار کیا اس کے پورے احترام اور اس سے استفادہ کرتے ہوئے دور جدید میں تفسیری تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے اس لٹریچر سے ایک گونہ de-contextualization کی خدمت بھی انجام دی تاکہ اس ابدی ہدایت کی روشنی میں نئے مسائل کا حل تلاش کیا جا سکے اور اس طرح کیا جا سکے جو اصل اور اولیں contextualization سے ہم آہنگ اور

تواتر کے استقرار کا ضامن ہو۔ یہ بڑا نازک اور بڑا مشکل کام تھا اور بلاشبہ اسے اجتہادی لغزشوں سے مکمل طور پر پاک قرار نہیں دیا جا سکتا اور اختلاف کرنے والے اس پر انگشت نمائی بھی کرتے رہیں گے۔ حقیقت کا علم تو صرف اسی کو ہے جس کا یہ کلام ہے۔ لیکن ہم جیسے طالب علم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فراہی صاحب اور اصلاحی صاحب کا یہ کام خود اعجاز قرآن کے ایک منفرد پہلو کو نمایاں کرتا ہے۔ ان بزرگوں نے یہ دونوں کام' انسانی حد تک' بڑی دقت نظر' بڑی ذمہ داری اور بڑے ادب و احترام سے انجام دیے اور قرآن کے طالب علموں کو بیسویں صدی ہی نہیں اکیسویں صدی کے مسائل اور چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لائق بنانے میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ بلاشبہ مستقبل میں بھی قرآن اپنے خزانے اسی طرح کھولتا رہے گا جس طرح ماضی میں کھولے ہیں اور حالات و ظروف کے بدلنے سے ایسے ایسے گوشے سامنے آتے رہیں گے جو پہلے گزرنے والوں کی نگاہوں سے اوجھل رہے ہیں۔ لیکن تحدیث نعمت کے لیے اس بات کا اظہار بھی ضروری ہے کہ ہمارے اپنے دور میں قرآن فہمی کی جو شمعیں ان بزرگوں نے روشن کی ہیں وہ راسخون فی العلم کی خدمات کی شان دار روایات کا حصہ ہیں اور بیسویں صدی کے اسلامی فکر کا روشن ترین باب۔ تفہیم القرآن' تدبر قرآن اور فی ظلال القرآن اس دور کے اسلامی لٹریچر کا ماحاصل اور ایک دوسرے کے لیے ازواج اور توام (شریک جسم بہنوں) کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس صدی کے لٹریچر پر نگاہ ڈال کر دیکھتا ہوں تو دل گواہی دیتا ہے کہ اگر یہ تفاسیر نہ ہوتیں تو امت کی غربت کا کیا عالم ہوتا اور الحمدللہ ان کی وجہ سے ہم کتنی بڑی علمی دولت سے مالا مال ہو گئے ہیں۔ ذالک فضل اللّٰہ یوتیہ من یشاء۔

اگر اسے گستاخی پر محمول نہ کیا جائے تو بڑے ادب اور عجز کے ساتھ اپنی اس خلش کا اظہار بھی کر دینا چاہتا ہوں کہ حدیث کی حجیت کے باب میں کسی تحفظ کے بغیر حدیث کے مقام اور استعمال' اور خصوصیت سے خبر احاد کے سلسلے مولانا اصلاحی صاحب کے موقف اور مقدمہ تدبر حدیث کے چند نازک مقامات کے بارے میں' مجھے اضطراب رہا ہے۔ نیز مسئلہ رجم کے سلسلے میں مولانا اصلاحی صاحب کے دلائل کی طرف عقل کے جھکاؤ کے باوجود دل و دماغ اسے قبول نہ کر سکے۔ لیکن یہ اور ایسے ہی چند دوسرے مقامات کے علی الرغم قرآنی فکر کی تفہیم اور اسلامی افکار و مسائل کی تشکیل جدید کے تسلسل میں مولانا اصلاحی صاحب کا بڑا حصہ ہے اور نصف صدی کا قصہ ہے' دو چار برس کی بات نہیں اور مجھے اس امر کے اظہار میں بھی قطعاً کوئی باک نہیں کہ بیسویں صدی کے اسلامی فکر کے معماروں میں سے نمایاں مفکر کی حیثیت سے مولانا اصلاحی کے اثرات تادیر قائم رہیں گے۔ (جاری)

وسائل کم نہیں پڑتے

محمد ایوب منیر

آبادی میں اضافہ' غذائی اجناس کی پیداوار میں کمی' ماحول پر تیزابی بارش کا اثر' جنگلات کی کمی اور معدنی ذخائر کے خاتمے کے حوالے سے شائع ہونے والے اعداد و شمار عموماً پریشان کرنے والے ہوتے ہیں۔ ہفت روزہ اکنامسٹ لندن (۲۰ دسمبر ۹۷) نے ماحولیات کے لیے ان خدشات کے حوالے سے ایک دلچسپ جائزہ لیا ہے (Environmental Scares)۔ یہ پیش کیا جا رہا ہے۔ (مدیر)

آج سے دو صدی قبل مالتھس نے آبادی کے مسئلے پر اپنے مشہور کتابچے سے ماحولیات کو موضوع بنا دیا۔ اس نے منطقی دلائل سے ثابت کیا کہ آبادی میں اضافہ ہندسی تناسب (۱' ۲' ۴' ۸' ۱۶...) سے اور اجناس کی پیداوار میں اضافہ حسابی تناسب (۱' ۲' ۳' ۴' ۵.....) سے ہوتا ہے۔ اس وقت ہر شخص نے مالتھس کو درست سمجھا' لیکن وہ غلطی پر تھا۔

۱۸۶۵ میں ' اسٹینلے جیونز نے اپنی کتاب میں منطقی طور پر ثابت کیا کہ چند سالوں کے اندر برطانیہ میں کوئلہ کم پڑ جائے گا۔ ۱۹۱۴ میں امریکہ کے محکمہ معدنیات نے متنبہ کیا کہ تیل کے ذخائر صرف مزید دس سال چلیں گے۔ ۱۹۳۹ اور ۱۹۵۱ میں امریکہ کی وزارت داخلہ نے اعلان کیا کہ تیل آیندہ تیرہ سال تک ختم ہو جائے گا۔ ہر بات غلط نکلی' غلط' بالکل غلط۔

ان پیش گوئیوں پر آمنا وصدقنا کہنے کے بجائے ماضی کے ریکارڈ کی وجہ سے اب تو چھاچھ بھی پھونک کر پینا چاہیے۔ صحافی' شہرت کے شوقین اور مختلف پریشر گروپ کے افراد اپنے مفاد کی خاطر ایک کے بعد ایک خبر سناتے چلے جا رہے ہیں۔ طرفہ تماشہ یہ ہے کہ انھیں اپنی ہر غلطی آیندہ کے لیے اپنے درست ہونے کا یقین دلاتی ہے لیکن ہمیں تو جب کبھی آنے والی تباہی سے ڈرایا جائے تو یاد کر لینا چاہیے کہ گذشتہ ڈراوے کا کیا حشر ہوا تھا؟

۱۹۷۲ میں کلب آف روم نے اپنی غیر معمولی اثرات کی حامل رپورٹ Limits to Growth (ترقی کی حدیں) شائع کی۔ ماحولیات کے علم برداروں کے نزدیک یہ رپورٹ معاشیات کی احمق دنیا میں عقل و دانش

کی آواز ہے۔ کیا اس میں درج پیشن گوئیاں سچی نکلیں؟ مذکورہ رپورٹ میں انتباہ کیا گیا تھا کہ تیل کے عالمی ذخائر ۵۵۰ ارب بیرل ہیں۔ امریکی صدر جمی کارٹر نے اعلان کر دیا کہ تمام تیل آیندہ دس سالوں میں استعمال کر لیا جائے گا لیکن ہوا یہ کہ ۱۹۷۰ اور ۱۹۹۰ کے درمیانی عرصے میں ۶۰۰ ارب بیرل تیل استعمال کیا گیا۔ گویا کلب آف روم کے تخمینوں سے ۵۰ ارب بیرل زیادہ۔ جبکہ ۱۹۹۰ میں تیل کے غیر استعمال شدہ ذخائر کی مقدار ۹۰۰ ارب بیرل تھی! (اس میں کول تار کے ذخائر شامل نہیں جو صرف البرٹا میں ۵۵۰ ارب بیرل سے زیادہ ہیں)۔

کلب آف روم نے اسی قسم کی غلط پیشن گوئیاں قدرتی گیس' تانبے' قلعی' جست' یورینیم اور ایلومینیم کے بارے میں بھی کیں۔ انھوں نے ہر ایک کے بارے میں کہا کہ اس کے ذخائر ختم ہونے والے ہیں اور ان کی قیمتوں میں تیزی سے اضافہ ہو جائے گا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ قلعی کے علاوہ ہر دھات کے معلوم ذخائر میں اضافہ ہوا ہے' بعض میں تو چار گنا۔ شاید Limits to Growth میں "ذخائر" کے معنی کچھ اور ہی لیے گئے! لیکن پیشن گوئیوں کے مسلسل غلط ثابت ہونے کے باوجود اس کلب کے اعتماد میں کمی نہیں آئی ہے۔ اس کے زیر اہتمام حال ہی میں Beyond the Limits (حدوں سے پرے) کتاب شائع ہوئی ہے۔ اس میں تحریر ہے: "مستقبل کے بارے میں ہم ماضی میں بھی ناامید تھے اور اب بھی اتنے ہی ناامید ہیں"۔ دیگر ماہرین ۱۹۹۰ کے بعد سے اس قسم کے اعلانات کے بارے میں محتاط ہو گئے ہیں۔

برطانوی اسکولوں کی ایک درسی کتاب کے ۱۹۸۳ کے ایڈیشن میں درج تھا کہ جست کے ذخائر ۱۰ سال میں اور قدرتی گیس کے ذخائر آیندہ ۳۰ برسوں میں ختم ہو جائیں گے۔ ۱۹۹۳ کی اشاعت میں جست کا ذکر حذف کر دیا گیا اور قدرتی گیس کی مدت پچاس سال کر دی گئی۔ یوں کتاب کے مرتب نے اپنا خود ہی مضحکہ اڑا دیا۔ شکر ہے صرف مقدار کا ذکر تھا اگر قیمتوں کا ذکر بھی ہوتا تو مزید خفت اٹھانا پڑتی۔

اب پھلوں اور غذائی اجناس کا معاملہ لیجیے۔ پال ایلڈرچ کی ۱۹۷۰ کی مقبول عام کتاب سے یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> ماہرین زراعت کے مطابق اگلے ۳۰ سال میں غذائی اجناس کی پیداوار کا تین گنا ہونا بہت ضروری ہے تا کہ ۲۰۰۰ کے آغاز پر دنیا کے ۶' ۷ ارب انسانوں کو مناسب خوراک مل سکے لیکن یہ واضح ہوتا جا رہا ہے کہ یہ عملاً بالکل ناممکن ہو گا۔

بنی نوع انسان کو غذا فراہم کرنے کی جنگ ہاری جا چکی ہے۔ ۷۰ کے عشرے میں دنیا میں کئی قحط آئیں گے' لاکھوں لوگ فاقوں سے مر جائیں گے۔

اس قسم کی رائے ظاہر کرنے میں ایلڈرچ تنہا نہیں ہے۔ ورلڈ واچ انسٹی ٹیوٹ کے لیسٹر براؤن نے ۱۹۷۳ میں پیشن گوئی کی تھی کہ جلد ہی آبادی پیداوار سے بڑھ جائے گی۔ جب کبھی گندم کی قیمت میں

عارضی طور پر اضافہ ہو، وہ ایسی پیشن گوئی ضرور کرتا ہے۔ ۱۹۹۴ میں جب لیسٹر براؤن کو غلط ثابت ہوتے اکیس سال ہو گئے تو اس نے کہا: "چالیس سال تک ریکارڈ غذائی پیداوار کے بعد اچانک غیر متوقع طور پر فی کس پیداوار بہت کم ہو گئی ہے"۔ اس کے بعد دو بہت اچھی فصلیں ہوئیں اور گندم کی قیمتوں میں ریکارڈ کمی ہو گئی، لیکن قنوطیت زدہ ماہرین حقائق سے کوئی اثر قبول نہیں کرتے جبکہ ان کے خیالات، اخبارات میں خوب مقبول ہیں۔

غذائی اجناس کے عالمی پیداوار کے حقائق ان افراد کے لیے چشم کشا ہوں گے جنھوں نے بھوک سے بنی نوع انسان کی ہلاکت کی پیشن گوئی سنی ہو۔ ۱۹۶۱ کی نسبت آج آبادی دگنی ہے لیکن اناج کی پیداوار دگنی سے بھی زائد ہے۔ فی کس اضافہ بیس فی صد ہے۔ یہ اضافہ صرف امیر ممالک تک محدود نہیں ہے۔ دیگر ممالک کی بھی یہی صورت حال ہے۔ عالمی ادارہ خوراک و زراعت (FAO) کے مطابق تیسری دنیا میں فی کس حراروں کا استعمال ۱۹۶۳ کی نسبت ۲۷ فی صد زیادہ ہے۔ آج قحط، فاقہ اور ناکافی غذا سے ہلاک ہونے والوں کی تعداد اتنی کم ہے کہ تاریخ میں کبھی نہیں رہی۔

کچھ معروف اہل دانش نے ۱۹۸۰ میں صدر امریکہ کے لیے گلوبل ۲۰۰۰ کے نام سے رپورٹ لکھی۔ یہ اتنی متاثر کرنے والی تھی کہ سی این این کا ایک پروڈیوسر معروضی نقطہ نظر اختیار کرنے کے بجائے ماحولیات کے حوالے سے ڈرانے والوں کا پرجوش وکیل بن گیا۔ مذکورہ رپورٹ میں یہ پیشن گوئی کی گئی تھی کہ آیندہ برسوں میں پیداوار کے مقابلے میں اضافہ آبادی کی رفتار زیادہ ہو گی۔ ۲۰۰۰ تک غذا کی قیمتوں میں ۳۵ فی صد سے ۱۱۵ فی صد تک اضافہ ہو جائے گا۔ اب بیسویں صدی ختم ہوا چاہتی ہے اور صورت حال یہ ہے کہ قیمتوں میں ۵۰ فی صد تک کمی واقع ہو چکی ہے۔ رپورٹ کے سچا ہونے کے لیے آیندہ دو سال میں ۵ گنا اضافہ ہونا چاہیے (کیا آپ شرط لگانے کو تیار ہیں؟)۔

شاید آپ سمجھیں کہ یہ تحریک طرفہ ہے۔ اگر پیشن گوئیاں بالکل غلط بھی ثابت ہوتی رہی ہیں لیکن نیت درست تھی، تو غلطی کا اعتراف بخوشی کیا جانا چاہیے تھا، جو کہ نہیں کیا گیا۔ جس وقت یہ تخمینے پیش کیے گئے اس وقت بھی صحیح بات کرنا، ناممکن نہ تھا۔ ایسے لوگ بھی موجود تھے، جنھوں نے ۱۹۷۰ میں اجناس کی پیداوار میں غیر معمولی اضافے کی پیشن گوئی کی، جنھوں نے ۱۹۷۵ میں تیل سستا ہونے کی پیش گوئی کی، جنھوں نے ۱۹۸۰ میں معدنیات کے وسیع تر ذخائر کی پیشن گوئی کی۔ ماحولیات کے علم برداروں نے ایسی پیشن گوئی کرنے والوں کو نظرانداز کیا اور برا بھلا کہا۔ بے شک سچ کڑوا ہوتا ہے۔

اسی دوران ماحولیات کے حوالے سے توجہ وسائل سے آلودگی کے مسئلے کی طرف منتقل ہو گئی۔ کہا جانے لگا کہ کینسر پیدا کرنے والے جراثیم، پانی، خوراک اور ہر جگہ ہوتے ہیں۔ گزشتہ سال البرٹ گولڈ اسمتھ

نے اپنے بھائی (عمران خاں کے خسر) کی موت کا ذمہ دار کیمیائی مادوں کو قرار دیا۔ کہا گیا کہ کینسر کیمیکل سے ہوتا ہے اور کینسر کی شرح میں اضافہ ہو رہا ہے' حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ ۳۵ سے ۳۹ سال تک کی عمر کے لوگوں میں' جہاں وجہ سگریٹ نوشی نہیں' شرح اموات میں ۱۹۵۰ کے بعد سے ۱۵ فی صد کی واقع ہوئی ہے۔

۸۰ کے عشرے کے اوائل میں تیزابی بارش (Acid Rain) ماحول کی تباہی کا سب سے زیادہ مقبول عام سبب قرار پایا۔ رپورٹیں شائع ہوئیں کہ جرمنی کے درختوں کی نصف تعداد کی زندگی خطرے میں ہے۔ اقوام متحدہ نے رپورٹ شائع کی کہ ۱۹۸۶ تک یورپ کے اندر پائے جانے والے درختوں کا ۲۳ فی صد جزوی یا کلی طور پر ان فضائی تیزابی مادوں کے زیر اثر ہو گا۔ لیکن ہوا کیا؟ سب ٹھیک ٹھاک رہے۔ یورپی جنگلات میں حیاتیاتی مادے کی مقدار (biomass) میں ۸۰ کے عشرے میں اضافہ ہوا' کوئی کمی نہ ہوئی۔ نہ جنگلات کم ہوئے' بلکہ سرسبز و شاداب ہو گئے۔ تصور اور حقیقت کا اسی طرح کا ایک فرق امریکہ میں دیکھنے میں آیا۔ اطلاعات آئیں کہ شمالی امریکہ کے جنگلات زہر آلود ہو کر مر رہے ہیں۔ ۷۰ کروڑ ڈالر کی کثیر رقم سے کرائے گئے ایک سرکاری سروے کے مطابق کہ امریکہ یا کینیڈا کے جنگلات میں کسی عمومی یا غیر معمولی کمی کی کوئی شہادت نہیں ہے۔

ماحولیات کے لیے جو ڈراوے آج بیان ہو رہے ہیں' ان سب کی ماں' گرمی کی عالمی لہر (Global Warming) ہے۔ اس پر کوئی جیوری نہیں بیٹھی ہے۔ لیکن صدر کلنٹن اپنا فیصلہ دے چکے ہیں۔ صدر سے اتفاق کرنے سے پہلے' دو اقتباسات کا مطالعہ کریں: ۱۹۷۵ کے نیوز ویک کے ایک شمارے میں ایک رپورٹ آئی کہ: "خنکی کی لہر کے سبب اور اس کی وسعت کے بارے میں ماہرین موسمیات کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ لیکن اس امر پر سب متفق ہیں کہ یہ رجحان بقیہ صدی میں زرعی پیداوار میں کمی کا باعث ہو گا"۔ دوسرا' امریکہ کے نائب صدر ایل گور کا ایک بیان ہے جو قومی اخبارات میں شائع ہوا: "سائنس دان متفق ہیں کہ گرمی کی عالمی لہر ایک حقیقت ہے اور اس کے بارے میں اقدام کرنے کا اصل وقت یہی ہے"۔

قنوطیت پسندوں کے لیے اس صدی کے اختتام پر' پریشانی کے اور کئی اسباب ہیں۔ ہاتھیوں کی نسل کا خاتمہ' پاگل گائے کا مرض' ایبولا وائرس کی وبا اور جنسی ہارمون کی طرح کام کرنے والے کیمیکل' سب ہی سے ڈرانا فیشن میں شامل ہے۔ اوپر جو ڈراوے بیان کیے گئے ان کی قسم اس سے علیحدہ ہے۔ بلاشبہ دونوں میں رجحان صحت مند نہیں' لیکن مبالغہ آمیز ضرور ہے۔

۱۹۸۴ میں اقوام متحدہ کے ذرائع نے دعویٰ کیا کہ ہر سال دو کروڑ دس لاکھ ہیکٹر زمین صحرا میں شامل ہوتی جا رہی ہے۔ یہ بات اب بالکل غلط ثابت ہو چکی ہے۔ نہ صحرا میں اضافہ ہوا ہے' نہ ہو رہا ہے۔ ۱۹۹۲

میں ایل گور نے اعلان کیا کہ ایسے زان کے ۲۰ فی صد جنگلات ختم ہو چکے ہیں اور ہر سال ۸ کروڑ ہیکٹر کے جنگلات ختم ہو رہے ہیں۔ حقیقی اعداد و شمار کے مطابق یہ رقبہ صرف ۹ فی صد ہے اور شرح صرف ایک کروڑ ہیکٹر سالانہ۔

گذشتہ تیس برسوں میں صرف ایک پیشن گوئی کچھ درست ثابت ہوئی ہے' یعنی جانوروں' پودوں اور پرندوں پر ڈی ڈی ٹی کے چھڑکاؤ کے اثرات۔ اس کے علاوہ ہر ڈراوا غلط ثابت ہوا ہے یا مبالغہ آمیز ثابت ہوا ہے۔ کیا آپ اگلے ڈراوے پر یقین کرلیں گے؟

ماحولیات کے بارے میں ڈراوے ایسے مراحل سے گزرتے ہیں جیسے سب کچھ پہلے سے طے ہو۔ ہم اسے یوں بیان کر سکتے ہیں کہ پہلا سال' سائنس دان کا ہوتا ہے جو کسی امکانی خطرے کی نشان دہی کرتا ہے۔ دوسرا سال' صحافی کا ہوتا ہے جو اسے سادہ سچائی بنا کر مبالغے کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ تیسرے سال' ماہرین ماحولیات اس بارات میں شامل ہوتے ہیں (کوئی بھی مہم ماہرین ماحولیات نے ازخود شروع نہیں کی) وہ مسئلے کو انتہا تک لے جاتے ہیں۔ یا آپ یہ مانیں کہ دنیا ختم ہونے والی ہے اور نیک جذبات سے بھر جائیں اور یا آپ کو بڑے کاروبار والوں کا تنخواہ دار ایجنٹ قرار دیا جائے۔ چوتھا سال' افسر شاہی کا ہوتا ہے۔ ایک کانفرنس منعقد کی جاتی ہے۔ سرکاری افسران کو ہوائی جہاز کے کلب کلاس کے ٹکٹ ملتے ہیں اور شہرت الگ حصے میں آتی ہے۔ سائنس کے بجائے اب مسئلہ حل کرنے کا ہو جاتا ہے۔ اس میں ایک علامتی ہدف کا تعین' کلیدی امر ہوتا ہے' مثلاً سلفر کے اخراج میں ۳۰ فی صد کی کمی' گرین ہاؤس گیسوں کے اخراج کا ۱۹۹۰ کی سطح پر استحکام' ایک لاکھ ۴۰ ہزار برطانوی گایوں کا قتل۔ پانچویں سال' ایک ولن تلاش کرلیا جاتا ہے اور اس پر یلغار کر دی جاتی ہے' مثلاً گرمی کی عالمی لہر کے امریکہ' تیزابی بارش کے لیے برطانیہ' اوزون کے لیے روس اور جنگلات کے خاتمے کے لیے برازیل۔ چھٹے سال میں کوئی شک کرنے والا اٹھ کر کہتا ہے کہ ماحولیات کی تباہی کے حوالے سے جو ڈراوا دیا جا رہا ہے' وہ مبالغہ آمیز ہے۔ یہ ماحولیات کے علم برداروں کو شدید غصے میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اخبارات کو خط لکھے جاتے ہیں کہ ایک حقیر اقلیت کے خیالات کو جگہ دینے کی جرات کیسے کی؟ لیکن اس وقت تک وہ سائنس دان جس نے اس پورے عمل کا آغاز کیا تھا خود شک کرنے والوں کی صف میں شامل ہو چکا ہوتا ہے۔ ساتواں سال' خاموشی سے معاملہ ختم کرنے کا ہوتا ہے۔ سرکاری طور پر مسئلے کا حجم سکیڑ لیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر آبادی کا دھماکہ' جب کسی کی توجہ اس طرف نہیں تھی تو ۱۵ ارب تک بیان کیا گیا۔ پھر اسے ۱۲ ارب کر دیا گیا' پھر دس ارب سے کم کیا جانے لگا۔ مطلب یہ ہوا کہ آبادی اب کبھی دگنی نہیں ہوگی۔ اسی طرح زمین پر گرمی کی لہر کو پہلے ناقابل کنٹرول بتایا گیا۔ پھر کہا گیا کہ یہ لہر ایک صدی میں ۲ء۵ سے ۴ درجے تک بڑھ رہی ہے۔ پھر کہا گیا کہ یہ اضافہ ۱ء۵ سے ۳ درجے تک ہے۔ اس طرح دو سال کے اندر اندر' ہاتھیوں کی نسل ختم ہونے کے شدید خطرے سے گزر کر یہ نوبت آئی کہ منع حمل کی تدابیر کی

ضرورت پیش آگئی! (حقائق تبدیل نہیں ہوئے' رپورٹنگ ہوئی ہے)۔

کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ ماحولیات کے امکانی خطرات کم کر کے پیش کرنے کے بجائے بڑھا چڑھا کر دکھایا جائے۔ ایسا ضروری نہیں ہے۔ یونی ورسٹی آف سسکس (Sussex) کے ملیسا اِیچ لور رابن میرنس نے اپنی کتاب' The Lie of the Land (دنیا کا جھوٹ) میں مستند طور پر بتایا ہے کہ افریقہ میں ساحل کے علاقوں میں آبادی کے دباؤ اور جنگلات کے ختم ہونے کے ڈراووں نے کتنا نقصان پہنچایا۔ اہل مغرب نے ماحول میں تبدیلی کے بارے میں مفروضہ تصورات درست ثابت کرنے کی خاطر سراسیمہ مقامی آبادیوں پر نامناسب اقدامات بہ جبر نافذ کر دیے۔ گیس اور تیل کے ذخائر ختم ہونے اور گرین ہاؤس اثرات کے بارے میں مفروضوں کی وجہ سے ایسی تدابیر اختیار کی گئیں کہ ویلز اور ڈنمارک میں بڑے بڑے علاقے اجاڑ دیے گئے۔

اسکولوں کی درسی کتب میں ماحولیات کی تعلیم کے حوالے سے یاسیت کا پرچار کیا گیا ہے۔ ان سے قحط' بیماری اور آلودگی کے خلاف عزم و حوصلے سے جنگ جیتنے کی کوئی امید پیدا ہونے کے بجائے شکست خوردگی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ آبادی کے دھماکے میں مسلسل مبالغہ آمیزی سے "مردم بیزاری" پیدا ہوتی ہے جو خطرناک حد تک فاشزم کے قریب پہنچا دیتی ہے۔ ڈاکٹر ایلڈرچ بڑی ڈھٹائی کے ساتھ جبریہ خاندانی منصوبہ بندی کا حامی رہا ہے۔ اس کا ایک ساتھی کہتا ہے کہ: "نسل بڑھانے کی آزادی ناقابل برداشت ہے"۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آبادی کنٹرول سے باہر ہوتی جا رہی ہے تو آپ کے نزدیک آزادی پر اس طرح کی غیر معمولی پابندیوں کا جواز ہو سکتا ہے لیکن اگر آپ جانتے ہوں کہ گراف اوپر نہیں جا رہا ہے تو آپ اپنے بھائیوں کے ساتھ ہمدردانہ رویہ اپنا سکتے ہیں۔

آپ قنوطیت پسند ہوئے بغیر بھی ماحولیات کے حق میں ہو سکتے ہیں۔ ماحولیات کی تحریک میں ایسے لوگوں کی جگہ ہونا چاہیے جو یہ سمجھتے ہیں کہ ٹیکنالوجی اور معاشی آزادی نہ صرف دنیا کو زیادہ صاف ستھرا بنا دیں گے بلکہ حیوانات کی جو نسلیں خطرے میں ہیں' ان سے بھی دباؤ ہٹ جائے گا مگر اس وقت ایسے رجائیت پسند' ماہرین ماحولیات کے لیے ناپسندیدہ ہیں۔ ڈاکٹر ایلڈرچ معاشی اضافے کو کینسر خلیے میں اضافے کے مماثل قرار دیتا ہے۔ اس موقف میں وہ تنہا نہیں ہے۔ ماہرین ماحولیات' صنعت و تجارت میں اپنے مخالفین پر الزام عائد کرتے ہیں کہ وہ اپنے مفادات کے لیے کام کر رہے ہیں لیکن الزام لگانے والوں کی اپنی آمدنیاں' ترقیاں' شہرت حتیٰ کہ ان کا وجود تک ماحولیاتی خطرات کے بارے میں سراسیمہ کر دینے والے اعلانات پر منحصر ہے۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے: عملی سیاست کا مقصد عوام کو ہر وقت خطرے کی حالت میں رکھنا ہے۔ انھیں ڈراووں کے نہ ختم ہونے والے سلسلے کی زد میں رکھ کر' سب کے سب خیالی—— تاکہ وہ تحفظ کے طالب ہوں اور پیچھے پیچھے آئیں۔

کم سے کم یہ پیشن گوئی درست معلوم ہوتی ہے۔

رسائل و مسائل

جرم و سزا اور توبہ و استغفار

تفسیر ماجدی میں ہے کہ جن گناہوں کے لیے حد شرعی مقرر ہے (شراب نوشی، زناکاری، چوری وغیرہ) وہ جب تک حد جاری نہ ہو جائے محض توبہ و استغفار سے معاف نہیں ہو سکتے۔ یہ بات کچھ سمجھ میں نہ آئی۔ ایک شخص سے غلطی یا کوئی بہت ہی سخت لغزش ہو جائے، اب وہ انتہا نادم ہو، ہر طرح توبہ و استغفار خلوص قلب کے ساتھ کر رہا ہو اور ثابت عہد اس معصیت کے نہ دہرانے کا کر رہا ہو، پھر بھی خدائے غفور و رحیم اس کو معاف نہیں کرتا۔۔۔ یہ تو ارحم الراحمین سے بہت بعید معلوم ہوتا ہے۔ پھر جب ایسی نظیریں پہلے بھی گزر چکی ہیں اور اس زمانہ حال میں بھی گزری ہیں کہ اکابر سے بھی اپنی عمر کے کسی دور میں شدید لغزشیں اور خطائیں سرزد ہوئیں لیکن بعد کو وہ ایسا سنبھلے کہ ان کا وجود امت کے لیے باعث فخر بن گیا تو ایسے حضرات کو کیسے قیامت تک کے لیے عذاب میں گرفتار فرض کر لیا جائے؟

مسئلے کی صحیح صورت وہی ہے جو خود سائل کے ذہن میں ہے۔ تفسیر میں عبارت تنگ رہ گئی ہے اور مسئلے کی پوری صورت واضح نہ ہو سکی۔ اللہ معاف فرمائے۔ اب اس میں تصحیح اور اصلاح تو صرف طبع ثانی ہی میں ممکن ہے۔ وہاں مراد یقیناً یہ ہو گی کہ مجرم کی آہ و فریاد سے متاثر ہو کر کسی واجب الحد جرم میں حد ساقط کر دینا کسی دنیوی حاکم، قاضی وغیرہ یہاں تک کہ پیمبر کے بھی اختیار میں نہیں۔ یہ مراد نہیں ہو سکتی کہ عاصی تائب کو اللہ ارحم الراحمین بھی اپنی قدرت و رحمت سے معاف نہیں کر سکتا۔

جب کفر جلی اور شرک تک، کہ ان سے بڑھ کر کوئی معصیت اس پردۂ زمین پر ممکن نہیں، توبہ کے بعد معاف ہو جاتے ہیں تو پھر شراب نوشی، چوری وغیرہ کے جرم تو کہیں ہلکے ہیں۔ ان کی بنیاد پر بندۂ تائب کیوں مایوس ہو جائے؟ قبول توبہ کا قانون (گناہ جو اور جیسا بھی ہو) قرآن مجید نے تین جگہ بڑی صراحت سے بیان کر دیا ہے اور دلالتاً و ضمناً تو اور متعدد جگہ بھی۔

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ مِن قَرِيبٍ فَأُولَٰئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا (النساء ۴:۱۷)

"ہاں یہ جان لو کہ اللہ پر توبہ کی قبولیت کا حق انھی لوگوں کے لیے ہے جو نادانی کی وجہ سے کوئی برا فعل

کر گزرتے ہیں اور اس کے بعد جلد ہی توبہ کر لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر اللہ اپنی نظر عنایت سے پھر متوجہ ہو جاتا ہے اور اللہ ساری باتوں کی خبر رکھنے والا اور حکیم و دانا ہے۔

من قریب (جلدی) کی گنجائش صحابیوں اور تابعین کی مستند تفسیر میں قبل موت تک کی ہے۔ اسی طرح دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے: كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (الانعام ۶:۵۴) "تمھارے رب نے رحم و کرم کا شیوہ اپنے اوپر لازم کر لیا ہے (یہ اس کا رحم و کرم ہی ہے کہ) اگر تم میں سے کوئی نادانی کے ساتھ کسی برائی کا ارتکاب کر بیٹھا ہو پھر اس کے بعد توبہ کر لے اور اصلاح کر لے تو وہ اسے معاف کر دیتا ہے اور نرمی سے کام لیتا ہے۔ البتہ جن لوگوں نے جہالت کی بنا پر برا عمل کیا اور پھر توبہ کر کے اپنے عمل کی اصلاح کر لی تو یقیناً توبہ و اصلاح کے بعد تیرا رب ان کے لیے غفور اور رحیم ہے"۔

صراحتیں قبول توبہ کی اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہیں، اور خود توبہ کی حقیقت شریعت میں یہ بتائی گئی ہے: ۱- ماضی پر ندامت، ۲- مستقبل میں ترک معصیت کا عزم، ۳- تدارک و تلافی بقدر امکان۔

ایک جگہ صراحت کے ساتھ واجب الحد مجرموں اور ان کی سزاؤں کا بیان ہے:

"جو لوگ لڑتے رہتے ہیں اللہ اور اس کے رسولؐ سے اور ملک میں فساد پھیلاتے رہتے ہیں، تو ان کی سزا بس یہی ہے کہ وہ قتل کر دیے جائیں یا سولی پر چڑھا دیے جائیں یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف جانب سے کاٹ دیے جائیں یا وہ ملک بدر کر دیے جائیں۔ یہ تو ان کی رسوائی دنیا میں ہوئی اور آخرت میں ان کے لیے بڑا عذاب ہے"۔

لیکن انھی باغیوں، خونیوں، ڈاکوؤں اور مفسدوں کے لیے معاً بعد ہی صراحت بھی موجود ہے:

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (المائدہ ۵:۳۴) "مگر جو لوگ توبہ کر لیں قبل اس کے کہ تم ان پر قابو پاؤ--- تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے"۔

توبہ کے بعد تو ایسے شدید، واجب الحد مجرموں سے بھی حد ساقط ہو جائے گی اور صفات مغفرت و رحمت اپنی پوری تجلی دکھائیں گی۔

یہ تو عام قاعدہ ہوا۔ پھر ہندستان اور پاکستان اور آج کے وہ سارے ملک جن میں نظام شریعت سرے سے برپا ہی نہیں وہاں تو اجرائے حد کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

یہ جواب یہاں تک پہنچ کر ختم ہو رہا تھا کہ سورۂ البقرہ کی آیت ۱۹۲ نظر میں آگئی۔ اوپر سے حکم مشرکین و معاندین سے قتال کا چلا آ رہا ہے، آگے ہے: فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ "پھر اگر وہ باز آ

جائیں، تو جان لو کہ اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے"۔ اور اس کے تحت میں فقہا و مفسرین نے صراحتاً لکھا ہے کہ جب شرک و کفر سے توبہ قبول ہو سکتی ہے تو قتل عمد تو اس سے خفیف تر ہے۔ اس سے توبہ کیوں نہ قبول ہوگی، اور قاتل عمد کی توبہ کا مسئلہ اس سے مستنبط کیا ہے۔

ابوبکر جصاص رازی حنفی کی احکام القرآن میں ہے: "اس سے دلالت اس پر ہوتی ہے کہ قاتل عمد کی بھی توبہ ہو سکتی ہے۔ کیونکہ کفر تو گناہ میں بہرحال قتل سے بڑھا ہوا ہے اور اللہ یہاں خبر دے رہا ہے کہ وہ کافر کی توبہ قبول کر لیتا ہے، اسے بخش دیتا ہے"۔

اور ابن حیان کی تفسیر بحر المحیط میں ہے: "آیت میں دلالت ہے قاتل عمد کی قبول توبہ پر، اس لیے کہ کفر تو قتل عمد سے بڑھ کر معصیت ہے۔ اور اللہ خبر دے رہا ہے کہ وہ کفر سے توبہ قبول کر لیتا ہے"۔

اور امام رازیؒ نے تفسیر کبیر میں اس سے بھی زیادہ صاف لکھ دیا ہے: "آیت اس پر دلالت کر رہی ہے کہ توبہ ہر گناہ سے قبول ہو سکتی ہے اور جس نے یہ کہا کہ قاتل عمد کی توبہ غیر مقبول رہتی ہے، اس نے اس قول میں غلطی کی۔ اس لیے کہ شرک تو قتل سے شدید تر ہے۔ جب اللہ کافر کی توبہ قبول کر لیتا ہے تو قاتل کی توبہ تو قبول کی مستحق تر ہے"۔

اور صاحب روح المعانی نے بھی صاحب بحر کے قول کو دہرا دیا ہے۔ دل کو بڑی تقویت دین کے ان زبردست شارحوں کی تائید سے حاصل ہو گئی۔

اس کے بعد ہی ذہن ابن القیم کی مشہور کتاب اعلام الموقعین کی طرف گیا۔ اصل کتاب تو فی الفور موجود نہ تھی، البتہ اس کا اردو ترجمہ "دلائل المحققین" کے نام سے مل گیا۔ سند کے لیے وہ بھی کافی ہے۔ اس میں ذیل کی عبارتیں نظر پڑ گئیں:

اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان گناہوں پر حد واجب کر دی جن کے ارتکاب کا طبعی تقاضا ہے اور جن کی روک تھام طبعاً نہیں ہے۔ حدیں خدا کی سزائیں ہیں، دنیا میں جیسے اس کی سزائیں ہیں، آخرت میں بھی ہیں، جبکہ وہ لوگ بے توبہ مریں۔ ہاں توبہ کرنے والا خدا کے نزدیک مثل گناہ نہ کرنے والے کے ہے۔ بس جس نے موت سے پہلے خالص توبہ کر لی، اسے اس گناہ پر سزا نہ دے گا۔ یہی حال احکام دنیا کا رکھا ہے کہ جب اس نے خلوص سے توبہ کر لی، اس سے پہلے کہ اسے امام تک پہنچایا جائے، تو اس کے اوپر سے حد گر گئی۔ زیادہ صحیح قول علما کا یہی ہے لیکن جب امام تک معاملہ پہنچ گیا تو اب توبہ سے حد ساقط نہ ہوگی۔ (دلائل المحققین، حصہ پنجم، ص ۷۰، مطبوعہ دہلی)

اور خیر یہ سوال تو پھر بھی ہلکا یعنی توبہ کے بعد اسقاط حد کا ہے۔ قرآن مجید میں تو اس سے بڑھ کر یعنی بغیر توبہ کے بھی مغفرت کی بشارت موجود ہے۔ سورہ رعد کے اندر خود یہ الفاظ موجود ہیں: وَاِنَّ

وَرَبَّکَ لَذُوْ مَغْفِرَۃٍ لِّلنَّاسِ عَلٰی ظُلْمِھِمْ، "اور بے شک آپ کا پروردگار لوگوں کے حق میں باوجود ان کے ظلم کے صاحب مغفرت ہے"۔ جس کے لیے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل ہوتا چلا آرہا ہے: "لیس فی القرآن ارجی لیۃ من ھذہ"، "قرآن مجید میں اس سے بڑھ کر پرامید و پرتسلی کوئی آیت نہیں ہے"۔

عَلٰی ظُلْمِھِمْ کی تصریح قرآنی پر غور ہو تو بہ کے بعد تو گناہ گار "گناہ گار باقی ہی نہیں رہتا۔ اس کا گناہ معاف ہو ہی جاتا ہے۔ یہاں تو یہ تصریح ہے کہ بندوں کے ظلم و زیادتی کے ہوتے ہوئے اللہ اس کے حق میں صاحب مغفرت ہے، جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ غیر تائبین کے بھی حق میں صاحب مغفرت ہے۔ اکابر اہل سنت کا تو یہی مسلک ہے۔ امام رازیؒ تفسیر کبیر میں کہتے ہیں: "ہمارے بزرگوں (یعنی اہل سنت) نے آیت سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اللہ تعالیٰ گناہ کبیرہ بغیر توبہ کے بھی معاف کر دیتا ہے"۔

اور بیضاوی میں ہے: "علی ظلمھم کی قید اس پر دلیل ہے کہ توبہ کے بغیر بھی معافی ہو سکتی ہے۔ اس لیے کہ جو تائب ہو گیا وہ پھر ظالم ہی کہاں رہا"۔ (مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ)

غیر محرم کے ساتھ حج

میری بیوی کے ساتھ اس کی بھابی جن کے لیے میں غیر محرم ہوں، حج پر جانا چاہتی ہیں۔ بعض دوسرے اعزہ کا بھی ساتھ ہے۔ مجھ سے پوچھا گیا کہ کیا اس صورت میں میری زوجہ کی بھابی ہمارے ساتھ حج کو جا سکتی ہے۔ میں نے محمد یوسف اصلاحی کی کتاب آسان فقہ (حصہ دوم) صفحہ ۲۵۰-۲۵۱ کے حاشیہ میں درج ذیل عبارت کی روشنی مین اثبات میں جواب دیا:

"جس خاتون کا شوہر نہ ہو اور کوئی ایسا محرم بھی نہ ہو جس کے ساتھ سفر حج میں جا سکے تو پھر وہ ان رفقا سفر کے ساتھ سفر کر سکتی ہے جن کی اخلاقی حالت قابل اطمینان ہو۔ یہ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کا مسلک ہے"--- مسئلے کی نزاکت کے سبب میں نے یہاں ایک مولوی صاحب، جو مسجد کے خطیب اور حافظ قرآن ہیں، سے پوچھا اور درج بالا کتاب کا حوالہ دیا۔ انھوں نے کہا "یوسف اصلاحی، مودودی ذہن کا بندہ ہے۔ حوالہ بھی غلط ہے۔ وہ عورت نہیں جا سکتی، حج نہیں ہو گا"۔ یہ اس مفتی کا فتویٰ ہے۔ اس سلسلے میں آپ سے رہنمائی درکار ہے۔

آپ نے اپنی اہلیہ کی بھابی کے متعلق جو استفسار کیا ہے کہ وہ آپ کے، درآں حالیکہ آپ کے ساتھ آپ کی زوجہ اور دوسرے متعدد افراد ہیں، حج پر جا سکتی ہیں یا نہیں، اور اس سلسلے میں آپ نے مولانا

محمد یوسف اصلاحی صاحب کی کتاب کا حوالہ دیا ہے کہ امام شافعیؒ نے اس کی اجازت دی ہے تو جواب یہ ہے کہ اس مسئلے میں علامہ انور شاہ کشمیریؒ کا فتویٰ بھی یہی ہے کہ حج کے لیے ایک خاتون اس وقت جاسکتی ہے جب فتنے سے اطمینان ہو اور معتمد علیہ خواتین کی جماعت اور معتمد علیہ قابل اعتماد غیر محرم مردوں کے ذریعے تحفظ حاصل ہو۔ (البتہ اس بات کا خیال رکھا جائے کہ اس کے لیے حکومت کے سامنے غلط بیانی سے کام نہ لیا جائے) فرماتے ہیں: **وفی کتب الحنفیة عامة عدم جواز السفر الا مع محرم قلت ویجوز عندی مع غیر محرم ایضا مع شرط الاعتماد والامن عن الفتنة وقد وجدت له مادة کثیرة فی الاحادیث اما فی الفقه فهو مسائل الفتن (فیض الباری، ج ۲، ص ۳۹۷، باب فی کم یقصر الصلوٰة)**

اس کے حاشیہ میں مولانا بدر عالم نے اس حدیث کا بھی حوالہ دیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو العاص سے، جو آپ کے داماد تھے، فرمایا تھا کہ صاحبزادی زینب کو مدینہ بھیج دیں اور جس آدمی کے ساتھ بھیجنے کا فرمایا تھا وہ ان کا محرم نہ تھا۔

نقل کردہ عبارت کا مطلب یہ ہے کہ غیر محرم کے ساتھ سفر کرنا، اس وقت منع ہے، جب کہ فتنے کا احتمال ہو۔ فقہ کی کتابوں میں جو بات ہے، اس کا تعلق فتنے سے ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں: "میرے نزدیک جائز ہے جبکہ فتنے کا خطرہ نہ ہو اور غیر محرم ایسا ہو جس پر اعتماد ہو، اور اس کے جواز کے لیے میرے پاس بہت سی احادیث ہیں۔ اس لیے مولانا محمد یوسف اصلاحی کی بات صحیح ہے۔ آپ کی اہلیہ کی بھابی آپ کے ساتھ حج کر سکتی ہیں۔ البتہ حکومت اگر سوال کرے تو بتا دیں کہ یہ میری اہلیہ کی بھابی ہیں اور اس طرح میں غیر محرم ہونے کے باوجود شرعاً محرم کی طرح، انھیں اپنے ساتھ حج کے لیے لے جا سکتا ہوں۔ فقہ شافعی اور فقہ حنبلی میں اس کی اجازت ہے اور فقہ حنفی کی باریکیوں کو سمجھنے والوں نے بھی اسے جائز قرار دیا ہے۔ واللہ اعلم۔ **(مولانا عبد المالک)**

معذوری اور بیماری میں اجر

میری عمر ۷۸ سال ہے۔ میں پہلے امام حسن البناؒ کی کتاب تزکیہ نفس کے اوراد و وظائف کیا کرتا تھا۔ اب آپ کے بتائے ہوئے چھ اوراد جو قرب الٰہی کے چند آسان عملی طریقے میں درج ہیں، شروع کر دیے ہیں اور قرآن پاک کا پورا پارا پڑھنا شروع کر دیا ہے، پہلے نصف پارا پڑھا کرتا تھا۔ پہلے تہجد میں سورہ جمعہ اعلیٰ، الفجر، النبا، المزمل، البروج پڑھا کرتا تھا اور اب آخری دس سورتوں میں سے مختلف سورتیں پڑھتا ہوں۔ پہلے میں ساری نمازیں مسجد میں پڑھتا تھا، ایک مسجد میں فجر کے بعد اور دوسری میں ظہر کے بعد، ایک رکوع کا ترجمہ اور تفہیم القرآن سے درس دیتا تھا۔ مگر اب نظر کم ہو گئی ہے۔ چلنے پھرنے سے معذور ہو چکا ہوں۔

میرے گھٹنوں میں' کبھی ایک میں اور کبھی دونوں میں' درد ہوتا ہے اور دو آدمیوں کے سہارے سے وضو کرتا ہوں۔ البتہ فجر کے وقت بڑی تکلیف سے خود ہی وضو کرتا ہوں۔ گھٹنوں میں بظاہر کوئی سوجن نہیں مگر درد کی وجہ سے سہارے کے بغیر چلنا مشکل ہے۔ اب کسی مسجد میں نہیں جا سکتا۔ صرف جمعہ کے لیے سکوٹر پر آتا جاتا ہوں۔ کسی مسجد میں درس نہیں دے سکتا۔ البتہ جہاد کشمیر' ادارہ دارالعلوم عربیہ اور جماعت اسلامی کو ماہانہ اعانت دیتا ہوں۔ کوئی گھٹنوں کا علاج آپ کو معلوم ہو' یا کوئی وظیفہ ہی ہو' جس سے میں چل پھر سکوں یا صرف دعا ہی فرمائیں۔

آپ نے جتنی اللہ کے دین کی خدمت کی ہے اور اس عمر کے باوجود اس بیماری کے ساتھ اب بھی کر رہے ہیں' یہ ہم جیسے لوگوں کے لیے قابل رشک ہے۔ اب آپ کی جتنی معذوریاں ہیں' بیماریاں ہیں' تو آپ اطمینان رکھیں کہ زمانہ صحت میں آپ جتنی تلاوت کرتے تھے' عبادات کرتے تھے' درس و دعوت کا کام کرتے تھے' راہ خدا میں چلتے پھرتے تھے' سب کا اجر آپ کو اب بھی مل رہا ہے۔ اعمال تو مقصود نہیں' اجر اور اللہ کی رضا مقصود ہے۔ اب آپ کو اللہ کی رحمت کا امیدوار اور اس پر شاداں رہنا چاہیے۔ اسی کو غالب ہونا چاہیے' اگرچہ مومن کا دل خوف اور اندیشے سے کبھی خالی نہیں ہو سکتا۔

سب سے اچھا وظیفہ تو آپ کے نیک اعمال اور دعا ہے۔ نماز فجر کے وقت سنت اور فرض کے درمیان ۴۱ بار سورۃ الحمد [سورۃ الفاتحہ] پڑھ کر اپنے بدن پر دم کر لیا کریں۔ سورۃ الحمد کی خاصیت شفا' احادیث سے ثابت ہے۔ گھٹنوں میں جہاں درد ہے' ہاتھ کی انگلیاں رکھ کر درج ذیل دعا پڑھ لیا کریں: تین مرتبہ بسم اللہ' اور سات مرتبہ اعوذ بعزۃ اللہ وقدرتہ من شر ما اجد من وجعی ھذا [میں اپنے اس درد کے شر سے اللہ کی عزت کے غلبے اور اس کی قدرت کی پناہ چاہتا ہوں]۔ باقی ہر تکلیف پر گناہوں کی معافی اور نیکیوں میں اضافے کے امیدوار رہیں۔ اللہ آپ کی مدد کرے گا۔ (خرم مراد' ۱۱ ستمبر ۹۶)

کتاب نما

تعارف القرآن (پانچ حصے)، حمید نسیم۔ ناشر: فضلی سنز (پرائیویٹ) لیمٹڈ، اردو بازار، کراچی۔ صفحات: جلد اول ۶۹۶، جلد دوم: ۵۳۵، جلد سوم: ۵۴۷، جلد چہارم: ۷۸۸، جلد پنجم: ۹۴۳۔ قیمت: جلد اول: ۳۵۰ روپے، جلد دوم: ۳۳۰ روپے، جلد سوم: ۱۸۰ روپے، جلد چہارم: ۳۰۰ روپے، جلد پنجم: ۴۰۰ روپے۔

مصنف، اعلیٰ تعلیم کے مرحلے میں ایم اے او کالج امرتسر میں، کٹر مارکسی اشتراکی اساتذہ کے زیر تعلیم و تربیت رہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ معروف اشتراکی صاحبزادہ محمود الظفر اور ان کی (ان سے بھی زیادہ اشتراکیت پر ایمان رکھنے والی) بیگم ڈاکٹر رشید جہاں نے، اساتذہ میں سے فیض صاحب کو اور طالب علموں میں سے مجھے، تربیت کے لیے منتخب فرما لیا اور نہایت موثر انداز سے مظلوم انسانیت کی نجات کے لیے مارکسزم ذہن نشین کرانا شروع فرمائی (ص ۵، اول)۔ لیکن اللہ نے حمید نسیم صاحب کو ہدایت عطا فرمائی اور: "کمیونزم ایک باطل نقش نکلا۔ جلد دماغ سے دھل گیا"۔ پھر وہ لمبے عرصے تک ریڈیو پاکستان سے وابستہ رہے، بالخصوص اس کی دینی نشریات سے۔ اس عرصے میں مصنف موصوف نے دنیا بھر کی سیاحت کی، بہت کچھ پڑھا۔ تقابل ادیان، فلسفہ، ادب، تاریخ، قدیم دیومالائی تصورات وغیرہ۔ وہ شعر کہتے ہیں، ادبی تنقید لکھی ہے۔ ان کی خود نوشت بھی چند برس قبل شائع ہو چکی ہے۔ اب قرآن پاک کی زیر نظر تفسیر پانچ جلدوں میں پیش کی ہے۔ اس کام میں انھیں مولانا محمد طاسین صاحب کی راہنمائی اور اعانت حاصل رہی۔

یہ مصنف کی خوش بختی ہے اور ان پر اللہ کا خاص کرم ہے کہ فیض احمد فیض کے ساتھ اور انھی اساتذہ کے زیر تعلیم و تربیت رہنے کے باوجود وہ فیض کے راستے اور انجام سے بچ نکلے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انھیں قرآن پاک کی تفسیر لکھنے کی سعادت عطا فرمائی: ایں سعادت بزور بازو نیست۔ حمید نسیم کا طریق توضیح و تفسیر اس طرح ہے: سب سے پہلے سورت کا تاریخی پس منظر، شان نزول اور معلومات، (کہیں کہیں ان میں تشنگی کا احساس ہوتا ہے) پھر چند آیات کا متن اور ان کا رواں اردو ترجمہ۔ پھر بعض مشکل الفاظ یا تراکیب کی وضاحت اور اس کے بعد ان آیات کے موضوعات و مباحث پر تبصرہ، توضیح اور تشریح۔

حمید نسیم کا اسلوب سیدھا سادہ، رواں دواں اور ہموار ہے۔ انگریزی الفاظ کے بلا جواز استعمال سے اکثر مقامات پر بہ آسانی بچا جا سکتا تھا۔ توضیح مطالب کے لیے اقبال اور رومی کے اشعار سے بھی جا بجا مدد لی ہے اور

بعض مغربی فلسفیوں اور مفکروں کے قول بھی نقل کیے ہیں۔ کہیں کہیں جوش خطابت میں وہ بہت تفصیل میں چلے گئے ہیں۔ ان کے ہاں دوسرے مفسرین سے استفادے کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں، مگر انھوں نے ابو الکلام آزاد کے سوا شاید ہی کسی کا حوالہ دیا ہو۔ مجموعی طور پر ان کی توضیحات میں راست فکری نظر آتی ہے۔

مصنف نے ایم اے فلسفے میں کیا تھا۔ بعد ازاں جدید مغربی فکر اور معاصر سیاسی و معاشرتی نظریات اور مفکرین و شعرا کا بالاستیعاب مطالعہ بھی کیا۔ انھوں نے پہلی جلد کے آخر میں (ص ۵۸۹ تا ۶۹۲) بعض عنوانات کے تحت اپنے وسیع مطالعے کا نچوڑ "عالمی فلسفہ و مذہب" کے عنوان سے جمع کر دیا ہے، جیسے: عالمی مابعد الطبیعیات (قدیم دیو مالائی تصورات، عقائد، نظریات) انسان کی فکری مسافت، مصری دیومالا کے اساسی افکار، قدیم بابل، تولیدی و افزائشی عبادات، اسرائیلیات، مذہب زرتشت کی دینیات، ہندو مذہب، الہیات اور مابعد الطبیعیات، بدھ مت، وشنو اور بھگوت کا فلسفہ، رواقیت، کلبیت اور تشکیک، افلاطون، فلاطینوس۔ دوسری جلد کے آخر میں (ص ۴۲۴ تا ۵۴۵) اخلاقیات عالم کے زیر عنوان: قدیم مصر، بابل، زرتشت، ہندومت، مہاتما بدھ، یونان، افلاطون اور ارسطو کی اخلاقیات۔ اسی طرح روس کی اشتراکیت اور نطشے وغیرہ پر تعارفی نوٹ۔ انھی ضمیموں کی وجہ سے جناب مولف نے کتاب کے عنوان میں "عالمی فلسفہ و مذہب کے تناظر میں" کے الفاظ کا اضافہ کیا ہے۔ یہ معلومات افزا نوٹس مصنف کے وسعت مطالعہ کی دلیل ضرور ہیں مگر بہتر یہ تھا کہ ان خیالات و افکار اور مباحث کو آیات قرآنی کی تفسیر میں متعلقہ مقامات پر زیر بحث لایا جاتا یعنی انھیں موقع و محل کے مطابق توضیحات و تشریحات میں کھپا (incorporate کر) دیا جاتا اور قرآن کی روشنی میں ان پر تنقید کی جاتی۔ موجودہ شکل میں یہ دونوں ضمیمے غیر متعلق اور الگ تھلگ محسوس ہوتے ہیں۔

بعض اوقات فاضل مصنف اپنے مخصوص نقطہ نظر یا اپنے مزعومات پر زور دیتے نظر آتے ہیں، مثلاً: "جب تک اسلامی معاشرہ وجود میں نہیں آ جاتا اہل لوگوں کے انتخاب کے لیے جمہوریت کے رائج اسالیب کو اختیار کرنا اسلامی اصولوں کے عین مطابق ہے"۔ (ص ۵۱، اول)--- سوال یہ ہے کہ "رائج اسالیب" میں تو ایک خائن، بدکردار اور جاہل مطلق شخص بھی پارلیمان کا ممبر بن سکتا ہے۔ کیا یہ "اسلامی اصولوں کے عین مطابق" ہو گا؟ پھر یہ کہ آج کل جمہوریت کے "رائج اسالیب" کے ذریعے کیا اہل لوگوں کا انتخاب ممکن ہے؟ ایک اور جگہ وہ کہتے ہیں: "اسلام میں جمہوریت ایسی بنیادی ضرورت ہے کہ اللہ کے رسول کو بھی حکم دیا گیا کہ وہ سب سے پہلے رائے لیں" (ص ۴۳۶، اول)--- حالانکہ قرآن حکیم تو یہ کہتا ہے کہ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (النساء ۴:۶۴)--- یعنی رسولؐ اللہ کے اذن (sanction) کا پابند ہے، نہ کہ اسے "جمہور کی رائے" لینی چاہیے۔ "جمہور" اور "جمہوریت" کے لیے اسی خبط میں انھوں نے ایک جگہ

ایسے "کچھ اہل الراے حضرات" کو ذہنی انتشار پیدا کرنے کا الزام دیا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ "قوت کا سرچشمہ اللہ ہے، عوام نہیں (ص ۵۱۱، اول)۔ مصنف نے غور نہیں کیا کہ "عوام" اور "جمہور" کی اس غیر معتدل حمایت میں وہ بعض آیات قرآنی کی نفی کر رہے ہیں، مثلاً: اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (یوسف ۱۲:۴۰) اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا (البقرہ ۲:۱۶۵) اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ (آل عمران ۳: ۱۵۴)۔ جب حاکمیت اللہ کی ہے تو پھر یہ کہنا بڑی ناوانی اور جہالت کی بات ہے کہ: "قوت کا سرچشمہ عوام ہیں"۔

اسی طرح وہ اس بات پر مصر ہیں کہ آنحضورؐ کو موزوں طبع تسلیم کیا جائے۔ جن احادیث سے آپ کی موزوں طبعی کی نفی ہوتی ہے، مصنف نے کسی دلیل کے بغیر یکسر "ایسی سب روایتیں غلط" قرار دی ہیں۔ ان کے خیال میں ان روایات کے سلسلے میں اسماء الرجال کے ماہر بھی غلطی کر گئے ہیں (ص ۲۵۳، چہارم)۔ جن مفسروں نے بعض معتبر روایات کے حوالے سے لکھا ہے کہ شعر پڑھتے ہوئے، آپ سے لفظوں کا الٹ پھیر ہو جاتا، حمید نسیم کا ایسے موقر مفسرین کو "فطری بے ذوق، طبع ناموزوں رکھنے والے اور ذوق جمال سے محروم" قرار دینا، بالکل "جوابی کارروائی" محسوس ہوتی ہے۔ قرآن حکیم کی اس واضح آیت: وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ (یٰسین ۳۶:۶۹) اور بہت سی احادیث کی موجودگی میں محض ایک قیاس آرائی پر اصرار کرنا کوئی علمی رویہ نہیں۔ ان کی یہ دلیل کہ "رسولؐ ہر ایسی غلطی سے محفوظ تھا، جس پر اس کے مخاطب اعتراض کر سکیں اور جسے شخصیت کی خامی پر محمول کریں" اس لیے بے وزن ہے کہ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لکنت زبان، ان کی "شخصیت کی خامی" نہ تھی، اور نہ یہ کار نبوت میں سد راہ بن سکی (حالانکہ زبان کی لکنت تو ابلاغ میں بہت بڑی رکاوٹ ہوتی ہے) تو آنحضرتؐ کا شعر کو موزوں نہ پڑھ سکنا، ان کی شخصیت کی خامی کیسے بن گیا؟

ایک اور جگہ مصنف کا یہ بیان بھی بے اعتدالی کا مظہر ہے: "لینن تاریخ انسانی کے عظیم ترین مفکر قائدوں میں سے ایک تھا۔ اس حقیقت کو نہ ماننا، اپنے جہل کا ثبوت دینا ہے کہ اس کی عظمت برحق، خلوص بھی برحق" (ص ۵۳۲، دوم)۔

عام طور پر طبقہ علما کو ان کی "تنگ نظری" اور "تعصب" پر مطعون کیا جاتا ہے۔۔۔۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ حمید نسیم کا "طبقہ علما سے دور کا تعلق بھی نہیں۔ (رفیع الدین ہاشمی)

اسلامی معاشرہ کی تاسیس و تشکیل، صاحبزادہ ساجد الرحمٰن۔ ناشر: ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد۔ صفحات: ۲۲۴۔ قیمت: ۲۵ روپے۔

حضورؐ کی بعثت تاریخ عالم کا اہم ترین واقعہ ہے۔ اس کی بدولت دنیا ایک عظیم الشان انقلاب سے دوچار

ہوئی جس کے اسباب و محرکات اور اثرات و نتائج کا جائزہ لینے کی مساعی صدیوں سے جاری ہیں۔ قرآن و سنت میں قبل اسلام کے دور کو جاہلیت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جاہلیت کا اصل مفہوم کیا ہے؟ عربوں کی زندگی کے کون سے امور اس کے دائرے میں آتے ہیں؟ اسلام نے عربوں کے کن امور کو باقی رکھا اور کس حد تک؟ نیز کن امور کو مٹانے یا درست کرنے کی کوشش کی؟ ان سوالوں کے جواب سے بحیثیت مسلمان ہمیں قانون سازی کے عمل میں رہنمائی ملتی ہے جو ہر مہذب اور منظم معاشرے کی بنیادی ضرورت ہے۔ مخصوص زمان و مکان میں حضورؐ اور صحابہ کرامؓ نے اس ضرورت کی تکمیل کے لیے جو اقدامات کیے وہ ہر دور اور ہر علاقے کے مسلمانوں کے لیے مشعل راہ ہیں۔ اس کتاب کا مقصد یہ ہے کہ قانون ساز اداروں اور اشخاص نیز محققین کو اسوۂ حسنہ کی روشنی میں قانون سازی کے بنیادی لوازم خصوصاً اس حقیقت سے روشناس کرایا جائے کہ اسلامی معاشرے میں جب بھی قانونی امور پر غور و خوض ہو گا تو متعلقہ اداروں اور افراد کو اس زمانی اور مکانی ماحول کے ٹھوس حقائق کو مدنظر رکھنا ہو گا جن سے حضورؐ اور صحابہ کرامؓ دوچار ہوئے اور انھوں نے ایک خاص طرز عمل اختیار کیا۔ اس طرح سات ابواب پر مشتمل زیر نظر کتاب اسلامی معاشرے کی تشکیل کے اصل الاصول اور اس کے حرکی رجحان کی نشان دہی کی ایک مفید کوشش قرار دی جا سکتی ہے۔ اس کے ذریعے اسلامی تہذیب کے امتزاجی میلان اور اسلامی اصولوں کی آفاقیت و ابدیت بھی اجاگر ہوتی ہے۔

فاضل مصنف نے بتایا ہے کہ جاہلیت کی اصطلاح "ضد العلم" نہیں "ضد الحلم" ہے یعنی جاہلیت سے مراد یہ نہیں کہ قبل از اسلام اہل عرب علوم و فنون اور تہذیب و تمدن سے بے بہرہ تھے بلکہ یہ لفظ عربوں کے تہور اور اکھڑپن پر دلالت کرتا تھا۔ عربوں کے مزاج اور کردار کی اصلاح کی گئی تو دنیا کو بہادر، اولوا العزم اور انقلابی قسم کے مردان کار میسر آئے۔ عرب جاہلیت کے رسوم و رواج کے سلسلے میں صدر اسلام میں یہ روش اختیار کی گئی کہ نکاح و طلاق، بیع و شرا وغیرہ میں جو مروجہ طریقہ یا قانون مناسب اور مفید ہے، اپنا لیا جائے۔ جو نامناسب ہے، رد کر دیا جائے اور اگر ہو سکے تو ضروری اصلاح و ترمیم کے ساتھ اسے باقی رکھا جائے۔ خلفاے راشدین کے تقرر کے ضمن میں یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ان کے طریق انتخاب میں اختلاف کے باوجود ان کا تقرر اسلامی جمہوری روح کے عین مطابق تھا اور تفصیلات کا تعین ہر دور کے مخصوص تقاضوں اور صدر اسلام کے نظائر کی روشنی میں امت پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ مشاورت اور قیام عدل اسلامی حکومت کا طرۂ امتیاز ہے اور صدر اسلام میں اس کا بطور خاص اہتمام کیا گیا اور اس سلسلے میں عمدہ اصول و قواعد مرتب کیے گئے تاہم عدلیہ کی ہیئت ترکیبی، منصفین کے تقرر کی شرائط اور دیگر ضوابط کی تشکیل وغیرہ امور کو ہر دور کے ارباب حل و عقد کی ذمہ داریوں میں شامل کر دیا گیا ہے۔ حضورؐ نے صحابہ کرامؓ میں

جس انداز فکر کو پروان چڑھایا تھا' اس کے مطابق خلفاے راشدین نے دوسری قوموں کے تجربات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہر ایسے عرف یا رواج کو جو اپنے اندر خیر اور نفع رکھتا تھا اور نصوص اسلامی سے متصادم نہیں تھا' قبول کر کے اسے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا حصہ بنا دیا اور اس سلسلے میں کسی قسم کا تعصب آڑے نہیں آنے دیا۔

فاضل مصنف نے بحث کے دوران اکثر و بیشتر بنیادی ماخذ سے رجوع کر کے اپنی تحقیق کاوش کو مستند بنایا ہے تاہم بعض عربی کتابوں کے اردو تراجم کا استعمال اصول تحقیق کے منافی نظر آتا ہے۔ انھوں نے کتاب کے آخر میں جو فہرست کتب دی ہے اس سے ان کی جستجو کی وسعتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ کتاب کا اشاریہ قارئین کی سہولت کے نقطہ نظر سے بہت مفید ہے۔ اس طرح کی علمی کتابوں میں کمپوزنگ کی غلطیاں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ کاش کتاب اس پہلو سے بھی قابل تعریف ہوتی۔ (ڈاکٹر رحیم بخش شاہین)

حج بیت اللہ ' بصارت و بصیرت ' پروفیسر سید محمد سلیم۔ ناشر: شاہ تاج مطبوعات' اردو بازار' لاہور۔ صفحات: ۷۲۔ قیمت: ۲۵ روپے۔

حج کا تجربہ ہر شخص کے لیے کچھ اس نوعیت کا ہوتا ہے کہ وہ ضرور اس میں دوسروں کو شریک کرنا چاہتا ہے۔ شاید حج ناموں کی کثرت کی یہی وجہ ہو۔ ہر شخص کا یہی خیال ہوتا ہے کہ وہ بالکل ایک نئے انداز سے حج کی واردات کو پیش کر رہا ہے' جیسا پہلے کسی نے نہیں کیا! پروفیسر سید محمد سلیم نے ۱۹۸۵ میں حج کی سعادت پائی: "حج میں انوار و عرفان کا چشمہ بہتا رہتا ہے---- یہ عاجز بھی محروم نہیں رہا۔ علوم و عرفان کے ایک حصے کی اس عاجز و بے نوا پر بھی بارش ہوئی (ص ۳)"۔ زیر نظر کتاب اسی حصے کو ہم تک پہنچانے کے لیے لکھی گئی ہے۔ ۲۰ صفحات میں حج کا بیان ہے۔ اس میں طواف کے سات چکروں کی سات علیحدہ دعائیں بھی درج کی گئی ہیں (ص ۱۸ تا ۲۶)۔ اس کے بعد مناسک حج کی حکمتوں کے حوالے سے ہر مرحلے پر صاحب تحریر نے مخصوص انداز سے کلام کیا ہے۔ ابتدا میں خود لکھا ہے: "ساری ترجیحات و تصریحات اس بندۂ عاجز و خاطی کی ہیں"۔ مختصر تبصرے میں احاطہ ممکن نہیں۔ مثال کے طور پر انھوں نے شیطان کو کنکریاں مارنے کے لیے تین دن دینے کی توجیہہ یہ کی ہے کہ شر کی قوتیں خیر کے مقابلے میں تین گنا زیادہ ہیں (ص ۵۳)۔ سعی' دو پہاڑیوں کے درمیان ہے اس کا مطلب ہے کہ "حصول مقصد میں مشکلات کے پہاڑ آ سکتے ہیں" (ص ۴۸)۔ کعبے کے بارے میں لکھا ہے: "دنیا اس مسجد کا صحن ہے۔ یورپ میں جب نماز کی ضرورت پڑتی ہے تو کعبے کے آنگن میں کھڑے ہو کر وہ اپنی نماز ادا کرتا ہے۔ ایورسٹ اس کے صحن کا ٹیلہ ہے"۔ حلق کے بارے میں لکھا ہے: "جس طرح سر پر اب نئے بال آئیں گے اسی طرح وہ نئی زندگی کا آغاز کرے گا" وغیرہ۔

اس طرح اس مختصر کتابچے میں، نئے انداز سے مطالب و معانی کی ایک دنیا سمیٹ دی گئی ہے۔ قاری کو اپنے فکر کو مہمیز دینے کے لیے نکات ہی نکات ملتے ہیں۔ (مسلم سجاد)

الم تا علم، کشمیر، اصغر عابد۔ ناشر: دارالاشاعت القلم، ۸ شان پلازا، بلیو ایریا، اسلام آباد۔ صفحات: ۱۳۵۔ قیمت: ۱۲۰ روپے۔

آزادی کشمیر کے لیے ہمارے (معدودے چند) شاعروں، ادیبوں اور دانش وروں نے جو قلمی کاوشیں کی ہیں، نوجوان شاعر اصغر عابد نے اپنی زیر نظر کتاب کو اسی تسلسل میں پیش کیا ہے۔ ان کے نزدیک یہ ایک ملی اور قومی فریضہ ہے جس کی رو سے: "کشمیریوں کی جدوجہد آزادی کو خراج عقیدت پیش کرنا ہر اہل قلم پر لازم آتا ہے۔ میں نے اسی جذبہ ایمانی کو بروے کار لاتے ہوئے اپنے قلم کو ایک مجاہد کی طرح محاذ قرطاس پر آگے بھیج دیا ہے"۔

حصہ اول کی نظموں میں کشمیر ہی نہیں، بوسنیا، فلسطین اور بابری مسجد کے المناک پس منظر سے رونما ہونے والا، پورے عالم اسلام کا دکھ درد سمٹ آیا ہے، مگر شاعر حوصلہ، عزم و ہمت اور جرات و جذبہ شہادت سے سرشار ہے۔ وہ انسانیت کا بہی خواہ ہے اور مستقبل کے بارے میں پرامید ہے:۔

آنے والی صدی، روشنی کی صدی، زندگی کی صدی
اک اخوت، محبت اور انسانیت دوستی کی صدی
اس صدی میں نہ ہو گا کہیں بھی دھواں
آئنوں کی طرح صاف ہو گا سماں
اے خدا، تیرگی اور آلودگی سے بچا لے ہمیں

دوسرا حصہ بہ عنوان: "کشمیر" ایک طویل مثنوی ہے، جس میں صدیوں کی تاریخ کو سمیٹ دیا گیا ہے:۔

دل گرفتہ مادر کشمیر ہے
کب سے اس کے پاؤں میں زنجیر ہے

مثنوی کے ذریعے کشمیر کے منافق حکمرانوں، ریڈکلف، موَنٹ بیٹن، شیخ عبداللہ، اور ہندو سامراج کی منافقتوں، فریب کاریوں، عیاریوں کی ایک روداد سامنے آتی ہے۔ اصل میں تو یہ، روداد دل ہے:۔

یہ جو لکھی مثنوی کشمیر کی درد دل کی اصل میں تشہیر کی

مجاہدانہ جوش و جذبے میں، اصغر عابد نے شاعرانہ تقاضوں کو نظرانداز نہیں کیا اس لیے امید واثق ہے قارئین مجاہدانہ حرارت حاصل کرنے کے ساتھ، شاعرانہ لطف و مسرت سے بھی ہم کنار ہوں گے۔

کتاب کی کتابت، طباعت اور پیش کش اعلیٰ درجے کی اور سرورق جاذب نظر ہے۔(ر - ہ)

Muslim India (1857-1947) A Biographical Dictionary [مسلم ہندوستان ۱۸۵۷ تا ۱۹۴۷، ایک سوانحی لغت]، احمد سعید۔ ناشر: انسٹی ٹیوٹ آف پاکستان ہسٹاریکل ریسرچ، لاہور۔ صفحات: ۳۵۴۔ قیمت: ۳۵۰ روپے۔

پروفیسر احمد سعید متعدد کتابوں کے مصنف اور تاریخ کے نامور اسکالر ہیں۔ زیر نظر کتاب میں انھوں نے عہد غلامی کے ایسے مسلمانوں کے سوانحی کوائف جمع کیے ہیں، جو مثبت یا منفی طور پر آزادی کی تحریکوں سے وابستہ رہے ہیں۔ تحریک خلافت، کانگریس، مسلم لیگ، احرار، یونینسٹوں اور مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے وابستگان، نوابزادے، راجگان، پیرزادے، جاگیردار، مصنف، ادیب، اساتذہ اور صحافی وغیرہ وغیرہ--- مصنف نے کمال محنت و عرق ریزی اور کاوش و سعی سے یہ لغت مرتب کی ہے۔ یہ علمی اداروں کے کرنے کا کام تھا، جسے فرد واحد نے انجام دیا ہے۔ ان کا یہ کارنامہ بہرطور داد و تحسین کے لائق ہے--- (مگر ایک ستم ظریفی: تقریباً ایک ہزار افراد کی اس فہرست میں سید ابوالاعلیٰ مودودی کا نام نہیں آ سکا)۔ (ر-ہ)

اسلامی فکر کی تشکیل اور معاشرے کی تعمیر نو، محمد موسیٰ بھٹو۔ ناشر: سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ، ۱۸۶، لطیف آباد نمبر ۴، حیدر آباد۔ صفحات: ۷۴۔ قیمت: ۳۰ روپے۔

مصنف کے اس نئے مجموعہ مضامین کا موضوع "قومی اور اجتماعی زندگی کا بڑھتا ہوا وہ زوال ہے، جس نے ہر شعبہ زندگی کے افراد کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے"۔ ان مضامین میں اسلامی ثقافت کی ترقی اور اسلامی فکر کی تشکیل جدید پر بھی بحث شامل ہے۔ معاشی خوش حالی اور مادی ترقی کے باوجود، انسانیت جس بحران میں مبتلا ہے، بھٹو صاحب کے نزدیک اس کی نوعیت داخلی اور نفسیاتی ہے--- مصنف ایمانیات، عقائد اور عبادات کے ساتھ معاملات میں راستی اور معاشرت میں ایک معتدل رویے پر زور دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک اپنے نفس اور باطن کی اصلاح سب سے زیادہ ضروری ہے۔ اسی سے افراد کے اندر حکمت و بصیرت، دانش مندی اور نور ایمان پیدا ہوتا ہے اور زندگی شریعت کے تابع ہو جاتی ہے--- تعمیر کردار کے لیے جناب بھٹو نے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کی "مثالی شخصیت" کو متعارف کرایا ہے۔ موصوف کی زندگی اردو زبان و ادب کی تدریس و تحقیق میں گزری، مگر اللہ نے انھیں کردار اور فکر و نظر کی بہت سی خوبیاں عطا کی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی بزرگی کی بنیاد پر کشف و کرامات کا راستہ اختیار نہیں کیا بلکہ خدمت خلق کو مطمح نظر بنایا۔ ذکر و فکر اور اسلامی شریعت پر چلنے کی تلقین کی۔ ان کی اپنی زندگی سادگی، فقر، رواداری، محبت، فیاضی، ایثار اور

بردباری کا نمونہ ہے ---- بلاشبہ ان کا شمار عصر حاضر کے نابغہ روزگار افراد میں ہونا چاہیے۔ (و-ح)

کتب موصولہ

☆ **پارہ عم**، اردو انگریزی میں ترجمہ اور تشریح کے ساتھ، ناشر: بیت الحکمت، مدینتہ الحکمت، محمد بن قاسم ایونیو، کراچی۔ صفحات: ۱۱۸۔ قیمت: ۵۰ روپے۔ [آخری پارے کا عربی متن، آسان اور توضیحی اردو ترجمہ، علامہ عبداللہ یوسف علی کا انگریزی ترجمہ، اور نونہالان وطن کو مخاطب کر کے ایک مختصر تشریح---- بقول حکیم محمد سعید: "قرآن حکیم کی تعلیم اور تفہیم کے بغیر تعلیم و تربیت کا کوئی تصور ممکن نہیں۔ (اسی) سے سچے مسلمان اور اچھے انسان کا وجود ممکن ہو سکتا ہے"۔ ایک قابل قدر کتاب]۔

☆ **قرآنی عربی**، ڈاکٹر ابراہیم حافظ اسماعیل سورتی، مترجم: رضوان الحق، ناشر: قاف قرآنی عربی فاؤنڈیشن، برمنگھم۔ ملنے کا پتہ: اردو بک ریویو، ۱۷۳۹/۳ نیو کوہ نور ہوٹل، پٹوڈی ہاؤس، نئی دہلی، ۱۱۰۰۰۲۔ صفحات: ۴۸۷۔ قیمت: ۱۵۰ روپے۔ [سالہا سال کے تدریسی تجربات کے نتیجے میں اخذ کردہ طریقوں کی روشنی میں قرآنی عربی سکھانے کے لیے ایک مفید کتاب]۔

☆ **دعوت** (روزنامہ) خصوصی اشاعت: "تعلیم اور مسلمان آزادی کے بعد"، مدیر: پرواز رحمانی۔ پتہ: ۳۴۳ ابو الفضل ان کلیو، جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی۔ صفحات: ۱۳۶۔ قیمت: ۲۰ روپے۔ [آزادی کے بعد بھارت میں مسلمانوں کی دینی اور عصری تعلیمی صورت حال پر وہاں کے اساتذہ اور ماہرین تعلیم کے بیس معلومات افزا اور فکر انگیز مضامین]۔

☆ **حجاج کرام کے لیے آسان دعائیں**، ناشر: شعبہ حج، جماعت اسلامی کراچی، شکارپور کالونی، کراچی۔ صفحات: ۳۲۔ ہدیہ: ۱۰ روپے۔ [جیبی سائز کا خوب صورت مجموعہ۔ قرآن و حدیث کے ایسے اذکار اور دعائیں جن کا یاد کرلینا آسان ہے]۔

☆ **دعوت و تبلیغ کے رہنما اصول**، فتحی یکن، ترجمہ: محمد رضی الاسلام ندوی۔ ناشر: اسلامک بک فاؤنڈیشن، ۱۷۸۱ حوض سوئی والان، نئی دہلی۔ صفحات: ۱۵۵۔ قیمت: ۵۰ روپے۔ [مصنف کی کیف ندعو الاسلام کا عمدہ ترجمہ۔ دعوت کے طریقے۔ اسلامی نظام کے اہم اور بنیادی خطوط۔ بحث و گفتگو کے موضوعات۔ ایک مفید کتاب]۔

☆ **دیوان غالب**، مرزا اسد اللہ خاں غالب۔ ناشر: فضلی سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ۔ ۴، ماما پارس بلڈنگ، اردو بازار، کراچی۔ صفحات: ۳۴۴۔ (چھوٹی تقطیع) قیمت: ۱۰۰ روپے مجلد۔ [عمدہ کاغذ، بے داغ کتابت، خوب صورت حاشیے کے اندر خلیق گونگی مرحوم کی کتابت میں یہ یادگاری نسخہ، تحفے میں دینے کے لائق ہے]۔

☆ **نشید شیراز**، مولانا ظفر علی خاں، مرتبہ: پروفیسر جعفر بلوچ۔ ناشر: الحسن اکادمی، ۸ غزالی پارک، نزد وحدت کالونی، لاہور۔ صفحات: ۲۰۰۔ قیمت: ۱۰۰ روپے۔ [مرتب نے مولانا ظفر علی خاں کا فارسی کلام، ان کے اردو مجموعوں اور اخبارات و رسائل سے، بڑی محنت سے جمع کر کے حواشی کے ساتھ مرتب کر دیا ہے۔ یہ علمی خدمت لائق تحسین ہے]۔

مدیر کے نام

طالب ہاشمی، لاہور

اسلام کا انداز حکمرانی (فروری ۹۸) میں عمرو بن عاصؓ، گورنر مصر کے بیٹے کا نام عبداللہ شائع ہوا ہے۔ جمہور ارباب سیر اور مورخین کے مطابق کوڑے مارنے اور کوڑے کھانے والے صاحب عبداللہ نہیں، بلکہ دوسرے صاحب زادے محمد بن عمرو بن عاص تھے (دور فاروقی میں حقوق انسانی، مقالہ از جسٹس بی زیڈ کیکاؤس مرحوم، ص ۸۷، ضیائے حرم، لاہور، فاروق اعظم نمبر)

محمد صدیق، اسلام آباد

دستور کی قلب ماہیت (فروری ۹۸) بروقت انتباہ ہے۔ مجوزہ اصلاحات میں ان نکات کا اضافہ مناسب ہو گا۔ ۱- وزیروں کی تعداد محدود کرنا۔ ۲- صدر، وزیراعظم، گورنر اور وزرا کے معاوضے اور مراعات معقول سطح پر لانا۔ پنشن بند کرنا (چند سال کی کچی نوکری پر پنشن چہ معنی دارد)۔ ۳- انتظامی معاملات میں ممبران اسمبلی کی مداخلت بند کرنا۔ ۴- سرکاری ملازموں کے معاوضوں اور پنشنوں میں افراط زر کے تناسب سے اضافے کا خود کار نظام قائم کرنا۔

رفیع الدین ہاشمی، لاہور

ڈاکٹر حبیب اللہ چیمہ صاحب کی اس بات سے تو اتفاق مشکل ہے کہ اشعار، نفس مضمون کے ابلاغ و تفہیم میں رکاوٹ بنتے ہیں، میرے خیال میں تو یہ تفہیم و تشریح کو اور موثر بناتے ہیں--- البتہ: "پروف خوانی زیادہ توجہ سے کرنے کی ضرورت" سے متفق ہوں۔ فروری کے شمارے میں پہلے ہی صفحے پر لاپروائی کی مثال: "پرواہ"--- دو عملی یہ ہے کہ رسالے کے متن اور اشتہار و اعلانات کی لکھائی کے اصول الگ الگ ہیں۔ کیوں؟ "رسائل و مسائل" کے آخری دو حصوں پر جواب دینے والے کا نام نہیں ہے۔ فہرست میں فہم قرآن کے مترجم کا نام نہیں دیا۔ "حکمت مودودی" میں الجهاد فی الاسلام کا پورا حوالہ ضروری تھا۔ کیا "اموصت کافی نہیں؟ (ص ۴۰) "مادریت" بے محل ہے--- پوری فہرست بناؤں تو "مدیر کے نام" کے ۲ صفحے کفایت نہیں کریں گے۔ آخری صفحہ، سطر ۲۲: "برائے مہربانی" کے بجائے "براہ مہربانی" ہونا چاہیے--- جو چیز جتنی وقیع اور بارتبہ ہو گی، اسی معیار سے اسے پرکھا، دیکھا جائے گا۔

راشد منہاس انصاری (جنوری، ص ۷۱) کی خدمت میں عرض ہے کہ میر نقوی کا منظوم ترجمہ، عرصہ ہوا چھپ چکا ہے، راقم کے پاس موجود ہے۔ "رموز بے خودی" کے منظوم ترجمے بھی ہو چکے ہیں۔ (ڈاکٹر نہیں) پروفیسر محمد عثمان نے "اسرار و رموز" کا نثر میں ترجمہ نہیں کیا، ایک آسان سی شرح لکھی ہے۔

ترجمان: رسائل و مسائل (فروری ۹۸) میں تصور جشن پر جواب ڈاکٹر انیس احمد کا تھا۔ دوسرے میں

ضرورت نہ تھی۔ کوشش تو یہی ہوتی ہے کہ ہمارے قارئین فہرست نہ بنا سکیں بلکہ ایک غلطی بھی نہ پائیں لیکن.....

طارق حمید علوی' حجرہ شاہ مقیم' اوکاڑہ

مسلم ممالک میں خاندانی منصوبہ بندی (فروری ۹۸) میں امریکی سازش کو جس طرح بے نقاب کیا گیا ہے' اس پر مصنف کو مبارک باد۔ الجزائر پر مضمون میں تشنگی محسوس ہوئی۔

محمد خلیل' کراچی

شعر میں تو وہ تاثیر ہے کہ دو صفحات کا مطلب دو مصرعوں میں آ جاتا ہے۔ (مدیر کے نام' فروری ۹۸)۔ تحریریں مختصر ضرور ہونا چاہییں۔ طوالت سے استفادہ کرنے والے کم ہو جاتے ہیں۔ مسلم ممالک کی اسلامی تحریکوں پر مضامین کا انتظار رہتا ہے۔

راجہ محمد شریف' لنکا شائر

اشارات (فروری ۹۸) بہت مفید اور بروقت ہیں۔ انھیں علماے کرام' اساتذہ' وکلا اور جج صاحبان کے مطالعے کے لیے فراہم کیا جائے۔ اس کی بنیاد پر قومی ایجنڈا مرتب کر کے ملک کو بحران سے نکالنے کی جدوجہد کی جائے۔

عبدالکریم' فیصل آباد

مارکس کی انسان دوستی (فروری ۹۸) کو مسئلہ بنانے کی اب کیا ضرورت ہے؟ آپ نے ایک مردہ مسئلے پر ۱۳ صفحے ضائع کر دیے۔

شاہد اسلام' فورٹ عباس

اشارات' مسلم ممالک میں خاندانی منصوبہ بندی اور کارل مارکس کی انسان دوستی (فروری ۹۸) بہترین مضامین ہیں۔ کارل مارکس کی انسان دوستی پر تقابلی مضمون بہت اچھا انداز تفہیم ہے۔ عبدالقدیر سلیم نے کارل مارکس کی انسان دوستی کو ثابت کیا ہے اور سلیم منصور خالد نے کارل مارکس کی انسان دوستی کے پردے میں انسان دشمنی کو بڑے مدلل اور واقعاتی حوالوں سے واشگاف کیا ہے۔

محمد طاہر' کمیتی دیر

قرآن کا پیغام (جنوری ۹۸) میں محترم مرحوم مدیر خرم مرادؒ نے حق ادا کر دیا ہے۔ مرحوم کے علمی ورثے سے کچھ نہ کچھ شائع کرتے رہیں تاکہ ان کو بھی اجر ملتا رہے اور ہم بھی استفادہ کرتے رہیں۔

فرحت علی بونی' جدہ

اسلامی نظم اور اس کے لوازمات (جنوری ۹۸) پر تبصرے سے ہماری حوصلہ افزائی ہوئی ہے۔ البتہ یہ کہنا کہ جائزہ فارم کی تیاری کو نظرانداز کر دیا گیا ہے' صحیح نہیں ہے۔ صفحہ ۲۸' ۲۹ پر جائزہ فارم کا نمونہ اور تیاری کا طریقہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

حامد عبدالرحمن الکاف' صنعا' یمن

اشارات (جنوری ۹۸) میں قومی معیشت کی خوب تصویر کشی کی گئی ہے لیکن متبادل کیا ہے؟ ہمیں سود سے پاک قومی قرض کاری کے پروگرام دریافت کرنے ہوں گے۔ اسلامی مالی' اقتصادی' سیاسی اور اجتماعی موضوعات پر مسلسل بحث ومباحثہ ہو تو راہ عمل واضح ہو گی۔ اشاریہ (جنوری ۹۸) میں' میرا مضمون اسلامی بنک کاری' (نومبر ۹۷) نظرانداز ہو گیا۔ تحاریک اسلامی (ص ٦٦) کون سی ترکیب ہے؟ نہ عربی' نہ فارسی نہ ہندی۔ تحریکات یا تحریکیں کافی نہیں۔ مطعون کو معطون لکھا گیا ہے۔ (ص ٦٧' سطر ۳)

لیفٹیننٹ جنرل (ر) غلام صفدر بٹ' لاہور

معیشت کی زبوں حالی (جنوری ۹۸) پر تنقید درست ہے' لیکن اب ہم کیا کریں؟ ہم نے زراعت پر مناسب سرمایہ کاری نہیں کی ہے۔ ساری توجہ صنعت کو دی ہے۔ ہمارے پاس وسیع و عریض قابل کاشت زمین ہے جو بنجر پڑی ہے۔ دریاے سندھ کا کروڑوں مکعب فٹ پانی سمندر میں ضائع ہو جاتا ہے۔ ہمارے کاشت کاروں کے پاس مناسب کام نہیں ہے۔ موسم ایسا ہے کہ ہم ۳' ۴ فصلیں اگا سکتے ہیں۔ ہم اللہ کی نعمتوں اور اپنے وسائل کو ضائع کر رہے ہیں۔ ہم زراعت میں سرمایہ کاری کریں' ڈیم بنائیں' نہری نظام بہتر کریں' زمین کو مسطح کریں تو موجودہ پیداوار سے ۳' ۴ گنا حاصل کر سکتے ہیں۔ مصر اور میکسیکو ہم سے فی ایکڑ تین گنا حاصل کرتے ہیں اور اجناس برآمد کرتے ہیں۔ ہمیں نہ بیرونی امداد کی ضرورت ہے' نہ بیرونی مشیروں کی۔ یہ سب کام کرنے کے لیے ہمیں سیاسی قیادت کے قومی عزم و ارادے کی ضرورت ہے۔ (ترجمہ)

عزیز احمد' حیدر آباد

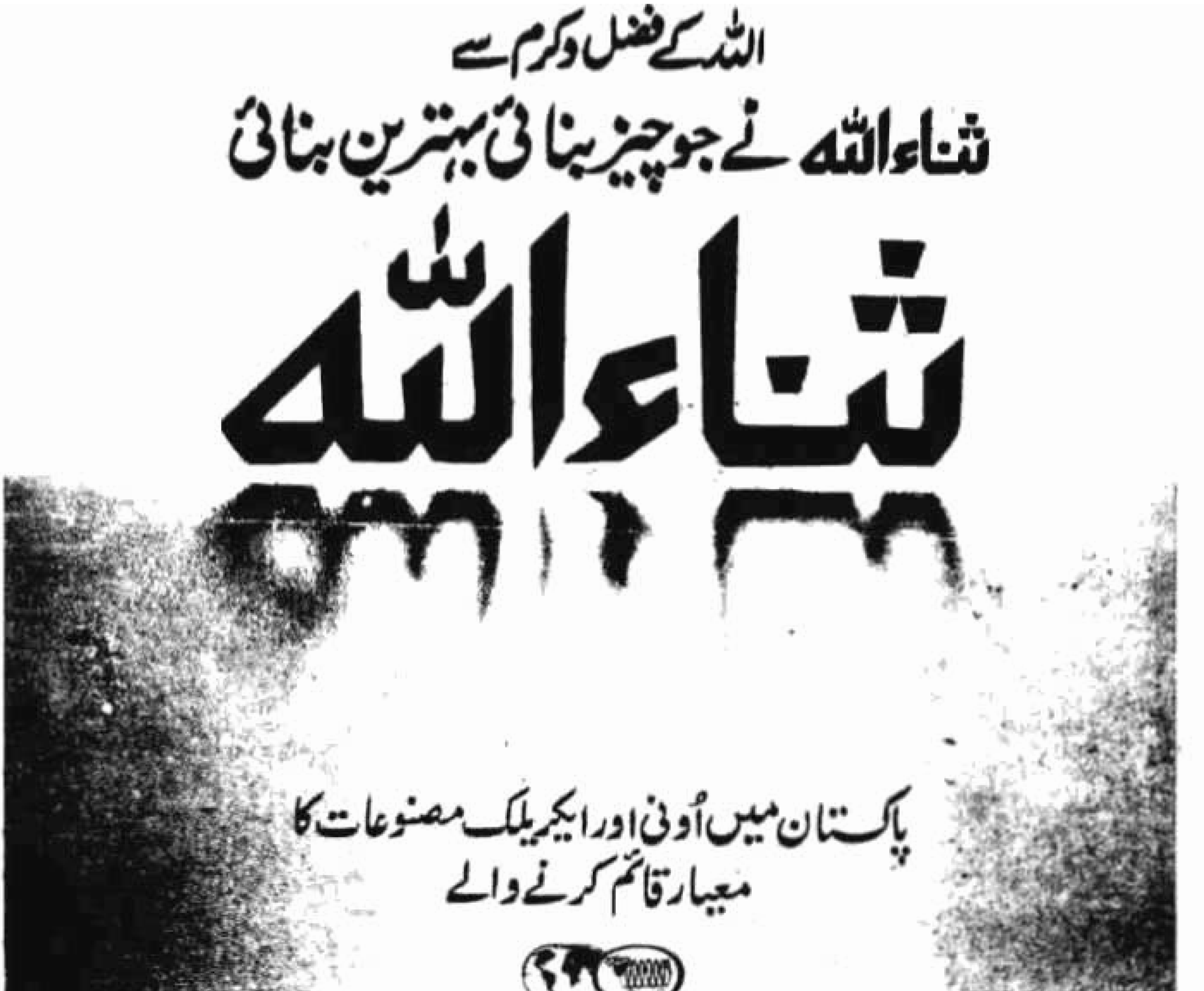
اسلامی ریاست کے بنیادی ادارے (جنوری ۹۸) پاکستان کے موجودہ حالات کے پس منظر میں بہت خوب رہا۔ ایسے مطالعوں کی ضرورت ہے۔

خالد حسین' ویسٹ یارک شائر

میری اردو بہت اچھی نہیں' پھر بھی گذشتہ دو برس سے ترجمان القرآن کی تحریریں پڑھ رہا ہوں' بہت دلچسپ اور اعلیٰ معیار کی ہوتی ہیں۔ ینگ مسلمز کے ساتھ ۳' ۴ سال کام کر کے میرا احساس ہے کہ کارکن اسلاف کے علمی ورثے سے اور تحریک کے اہل علم کی فکر سے آگاہ نہیں ہیں۔ یہ خلا ترجمان پر کر سکتا ہے۔ بعض مقالات پاکستان کے لیے مخصوص ہوتے ہیں' لیکن کئی مغرب میں موجود مسلمانوں کے لیے مفید ہو سکتے ہیں۔ کیا ترجمان کا انگریزی ترجمہ شائع نہیں ہو سکتا؟ اگر یہ بہت مہنگا اور وقت طلب ہو تو منتخب مضامین کے لیے تو یہ انتظام ضرور کرنا چاہیے۔ (ترجمہ)

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"جو شخص حج کا ارادہ کرے اسے جلدی کرنی چاہیے کیونکہ ممکن ہے وہ بیمار پڑ جائے' ممکن ہے اونٹنی کھو جائے (یعنی سفر کے ذرائع مسدود ہو جائیں' راستہ پر خطر ہو جائے' سفر خرچ باقی نہ رہے) اور ممکن ہے کوئی ضرورت ایسی پیش آ جائے جو سفر حج کو ناممکن بنا دے (لہٰذا جلدی کرو)۔ معلوم نہیں کیا افتاد پڑ جائے اور تم حج بیت اللہ سے محروم ہو جاؤ"۔ (ابن ماجہ)

اہم گزارش: ترجمان القرآن میں اشتہار دینے والے اداروں یا افراد سے معاملات میں کوئی نقصان ہو تو ترجمان القرآن کے نمایندے اس کے ذمہ دار نہ ہوں گے۔ قارئین کو چاہیے کہ کوئی معاملہ کرنے سے پہلے تحقیقات کریں اور اپنی ذمہ داری پر معاملہ کریں۔



اللہ کے فضل و کرم سے
ثناءاللہ نے جو چیز بنائی بہترین بنائی
ثناءاللہ
پاکستان میں اُونی اور ایکریلک مصنوعات کا
معیار قائم کرنے والے
ثناءاللہ وولن ملز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
ABC Cashmilla BLANKETS
ABC KNITTING YARNS
Plush Mink BED COVERS AND BLANKETS
SANAULLA CARPET YARNS
SANAULLA WEAVING YARNS
تیسری منزل، پیٹرولا سینٹر، فاطمہ جناح روڈ، کراچی، پاکستان۔
Phones: 516034 & 516035. Fax: 92-21-5681775.
Telex: 21699 SANA PK.

یہ جاننے کے لیے کہ
پچھلے نوّے سال سے زائد عرصے سے رُوح افزا
کروڑوں شائقین کا پسندیدہ مشروب کیوں ہے،
آپ کو کسی تردّد کی ضرورت نہیں :

صرف

رُوح افزا

کا ایک گلاس نوشِ جاں کیجیے۔



ہر قیمت پر معیار

ٹھنڈک اور فرحت لیے تازگی بھرا ذائقہ

ہمدرد

مدینۃ الحکمۃ تعلیم، سائنس اور ثقافت کا عالمی منصوبہ۔

Adarts-HRA-8/97

C .P.L. 236

Phone : 7587916
7585590

Monthly **TARJUMAN-UL-QURAN** LAHORE,